مُکرّم

محمد طفیل

اِدارہ فروغِ اُردو ○ لاہور
(ایبک روڈ، انارکلی)

مکرّم

مکرّم

محمد طفیل

اِدارہ فروغ اُردو ○ لاہور
(ایبک روڈ، انارکلی)

بارسوم : ۱۹۸۶ء
تعداد : ایک ہزار

طابع : نقوش پریس لاہور

ترتیب

رُونمائی

پانچویں کتاب!

لیجیے میں پانچویں پڑاؤ تک تو آن پہنچا۔ کیا عرض کروں۔ کیا گزری! راہ کٹھن تھی۔ زادِ راہ مختصر! —— تلملا کے رہ گیا

منزل تک پہنچنے کی آرزو تو ہے مگر سکت کم ہوتی جا رہی ہے۔ کروں بھی کیا، ادب کی منزل کا یہ ہے کہ جیسے جیسے بڑھتے جاتے ہیں۔ ویسے ویسے یہ دُور ہوتی جاتی ہے۔ یہ اندھیر صرف ادب میں دیکھا۔

موجودہ سفر کی روداد سنیے:۔

چوتھے اور پانچویں پڑاؤ کے درمیان، مجھے صرف تین مینار نظر آئے جن کی چھب اپنی اپنی ہے۔ شان اپنی اپنی ہے

پہلا مینار حسن و جمال کی آماجگاہ ہے۔ دوسرا تہذیب و فن کی، تیسرا عزم و استقلال کی! — اور میں ان تینوں کے سامنے ایک حیرت زدہ راہی!

قصّہ مختصر!

میناروں کی نقش آرائی کے بیان میں، میں نے اب تک تقریباً ایک ہزار صفحے کالے کر ڈالے۔ اتنی سیاہی میں سے اگر آپ کو چمکتی ہوئی دو ایک لائنیں بھی نظر آجائیں تو میں سمجھوں گا۔ سفر سپھل ہُوا۔

محمد طفیل

چہرہ نمائی

یہ مضمون اُس جلسے میں پڑھا گیا تھا، جو قومی کتاب مرکز (پاکستان) کی لاہور شاخ نے، میری تحریر کی خوبیاں یا خرابیاں دریافت کرنے کے لیے برپا کیا تھا۔

دیگر مقررین کے ساتھ میں نے بھی عرض کیا ——

—٥

صاحبِ صدر، معزز خواتین و حضرات!

زبان کو عقل سے صرف تین باتیں معلوم کرنی چاہئیں۔ کس سے بولے۔ کب بولے اور کیا بولے۔

اِس کُلیے کا حق ادا کیا جائے تو انسان ساری عمر سوچتا ہی رہ جائے اور کسی سے بھی کوئی بات نہ کرے۔ پھر بھی اتنا تو ہونا چاہیے کہ ہر ایک سے نہ بولے۔ کبھی کبھی بولے اور سوچ سمجھ کر بولے۔

اس فارمولے پر عمل کیا۔ تو بھی میرے لیے بات کرنی مشکل ہو جائے گی
لہٰذا مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ میں سے، ہر ایک سے بولوں اور بلا سوچے
بولوں، ورنہ میری باتوں میں بناوٹ آ جائے گی اور بناوٹ سے مجھے نفرت
ہے۔ محبت نہیں!

ابھی پچھلے دنوں، ایک جلسہ انٹرکانٹی نینٹل میں ہوا تھا۔ ایک یہ ہو رہا
ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے۔ یہ کام تو وہ تھے، جو
عموماً آپ حضرات کسی کے مرنے کے بعد کیا کرتے تھے۔

سمجھ میں صرف اتنا ہی آتا ہے۔ جیسے دنیا میں مروّت بڑھ رہی ہو۔
تنگ دلی گھٹ رہی ہو۔ اگر یوں نہ ہوتا تو یہ ہنگامہ نہ ہوتا۔ نہ شہاب صاحب
پنڈی سے تشریف لاتے۔ نہ کتاب مرکز والے جلسہ کرتے۔ نہ آپ اپنا
وقت ضائع کرتے۔

موجودہ صورت میں میں یہی کہوں گا۔ اے نیک خصال ساتھیو، میرا
سلام قبول کرو۔ اور اس کے بعد میرا احوال سنو!

بہ حیثیت ایڈیٹر، جب میں نے رسالے کا کام سنبھالا تو مدیروں نے کہا۔
تُو اور تو سب کچھ بن سکتا ہے۔ مگر مدیر نہیں بن سکتا۔

بہ حیثیت اسکیچ نگار، جب میں نے چند ایک خاکے لکھے تو ادیبوں نے
کہا۔ تُو اور تو سب کچھ بن سکتا ہے مگر ادیب نہیں بن سکتا۔

کہتے ہیں کہ ضد بہت بُری عادت ہے اگر وہ بُرے کاموں میں بروئے کار لائی جائے۔ لیکن اس سے بہتر بھی کوئی قوت نہیں۔ اگر وہ اچھے کاموں میں استعمال کی جائے۔ چنانچہ اس "نہیں بن سکتا" کے جواب میں، میں نے نقوش کے ذریعے ادب کے انبار لگا دیے اور اسی نہیں بن سکتا کی وجہ سے چند سطریں لکھ بھی ڈالیں۔ اگر مجھے جھنجھوڑا نہ جاتا تو مَیں مزے سے سو رہا تھا۔ بعض اوقات تازیانے بھی منزلوں کو قریب تر کر دیتے ہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے شکستِ امید اُمیدوں کو استحکام بخشتی ہے۔

اوروں کی طرح کبھی یہ خواہش تو تھی کہ اہلِ علم میرے کام کے بارے میں بھی بات کریں۔ سو یہ خواہش اس حد تک پوری ہوئی کہ Over Load ہو گیا۔ مگر یہ خواہش نہ تھی کہ مجھ سے جواب طلبی بھی ہو کہ کیوں لکھتا ہے؟ پھر یہ بھی کہ بر سرِ عام اس سوال کا جواب دو۔

سارے قلمکار یہ کہتے ہیں کہ لکھنے کو بڑا جی چاہتا ہے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ میرے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ میرا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ کہنے کو میرے پاس کچھ ہو تو ہو مگر لکھنے کو جی بالکل نہیں چاہتا۔ اس لیے کہ میرا موضوع خطرناک ہے۔ جس میں لکھنے والے کو دوستی کی چوکھٹ سے گر کر جیل کی سزا تک ہو سکتی ہے۔

پہلی کتاب مجبوری کے عالم میں لکھی تھی۔ احمدیوں کے خلاف ایجی ٹیشن تھی۔ ہنگامہ برپا تھا۔ کرفیو لگا ہوا تھا۔ چنانچہ قلم پکڑ کے لکھنا شروع کر دیا تھا۔

چند دنوں میں کئی مضمون ہو گئے

مضمون چھپے تو یاروں نے ورغلایا۔ اور لکھو۔ اور لکھو۔ ایسے مضمون تو کسی نے لکھے ہی نہیں۔ یہ فقرہ ذُو معنی تھا۔ مگر مَیں نے اس کے اچھے معنی سمجھ کر باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا۔ میرے مضمون زیادہ تر اُنھیں پسند آتے ہیں۔ جو میرے ممدوح نہیں ہوتے۔ جو ممدوح ہوتے ہیں۔ وہ چونکہ اپنے طور پر خدا ہوتے ہیں اس لیے انھیں اس بندے کے مضمون کیسے پسند آتے۔ وہ تو اللہ کا شکر کہ میرے ممدوحین میں سے کچھ افسانہ نکل آئے۔ یوں کچھ قلم گھسائی جاری رہی۔ ورنہ قلم رکھنا پڑتا۔

شخصیت نگاری بہتوں نے کی۔ مگر تلوار کی دھار پر چلنا، اُن میں سے ہر ایک نے ضروری نہ جانا۔ واقعہ یہ ہے کہ شخصیت نگاری صرف اور صرف تلوار کی دھار پر چلنے کا نام ہے۔ ایسی تلوار جس سے لکھنے والا بھی زخمی ہوتا ہے اور وہ بھی جو لکھنے والے کی زد میں ہو۔ میری شامتِ اعمال کہ مَیں نے اسی موضوع کو اپنایا۔ کس حد تک کامیاب ہوں اور کس حد تک ناکام اس کا کچھ واضح پتہ نہیں چلتا۔ مگر یہ بالکل واضح ہے کہ اس "کھیل" میں خود بھی زخمی ہوا۔ دوسروں کو بھی زخمی کیا۔ آخر میں خود زخمی ہونے یا دوسروں کو زخمی کرنے کا خطرناک کھیل کیوں کھیلتا ہوں؟ صرف اس لیے کہ کہیں شخصیت نگاری کے ضمن میں سچ بولنے کو گناہ نہ سمجھ لیا جائے۔

مَیں جانتا ہوں کہ جھوٹ اور خوشامد کے بڑے فوائد ہیں۔ یہ دوست

جس شخص میں بھی پائے گئے۔ اُس سے خدا ناراض ہو تو ہو، اس کے بندے ناراض نہیں ہوتے۔ چونکہ ہمیں بے شمار بندوں میں رہنا ہوتا ہے۔ اس لیے ایک خدا کی پروا کوئی نہیں کرتا۔

دانا یہ بھی کہتے ہیں کہ دنیا کا سب سے بڑا انکشاف جھوٹ ہے جس کے بغیر نہ بڑے آدمی کی جان بچ سکتی ہے۔ نہ چھوٹے آدمی کو اطمینان حاصل ہوتا ہے، مَیں نہ بڑا آدمی ہوں نہ چھوٹا آدمی، اس لیے میرا گزارہ جھوٹ کے بغیر بھی ہو جاتا ہے ویسے بھی جب سے ہم نے انسانوں کو فرشتہ بنایا۔ اصل شخصیتیں اوجھل ہو گئیں۔ مہربانوں نے ستائشی کلمات کے وہ وہ غازے اور وہ وہ پوڈر تھوپے کہ اصل صورتیں خوردبین سے بھی نظر نہ آئیں۔

ہمارے محققین پتہ نہیں کیا کرتے ہیں۔ انھیں چاہیے کہ ایسی تمام شخصیتوں کے منہ ہاتھ دھلوا دیں تاکہ ہم ان کی اصلی صورتوں کو دیکھ سکیں۔ میں نے اور گناہ کیے ہوں گے، مگر یہ گناہ نہیں کیا کہ کسی کو خوش کرنے کے لیے کتاب المناقب لکھی ہو یا کسی کو خوف زدہ کرنے کے لیے کتاب المعائب!

مَیں اپنی تحریروں کے بارے میں کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا۔ مگر ایک بات عرض کر دوں گا۔ مَیں نے جو کچھ لکھا۔ سوچ سمجھ کے لکھا اور یہ بھی کوشش کی کہ سوچ اپنی ہو۔ انداز اپنا ہو راہ اپنی ہو۔ اسی لیے ڈر بھی لگا رہتا ہے۔ میرے ہی ایک دوست کا شعر ہے ؎

یہ ارتقا کا چلن ہے کہ ہر زمانے میں
پرانے لوگ، نئے آدمی سے ڈرتے تھے

مجھے یہ دعویٰ بالکل نہیں کہ میں نے اس فن میں کوئی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور نہ ہی یہ احساس ہے کہ ارتقا کی سیڑھیاں چڑھ رہا ہوں۔ بلکہ گزارش صرف اتنی ہے کہ میں بھی نئی سوچ کے ساتھ اس میدان میں کھڑا ہوں

کچھ دوست بڑے دلچسپ سوال کرتے ہیں۔ مثلاً فلاں مضمون اچھا ہے اور فلاں مضمون اتنا اچھا نہیں۔ اسکیچ نگاری میں اچھا مضمون ہونا یا اچھا مضمون نہ ہونا بڑی حد تک، زیرِ بحث شخصیت پر منحصر ہوتا ہے۔ لکھنے والے کا تو کمال صرف اتنا ہے کہ وہ تحریری تیوروں کے ساتھ کانٹے کی تول کا بھرم رکھ لے۔ اس سے زیادہ شخصیت نگار سے توقع رکھنا عبث ہے۔

اس ضمن میں ایک اور بات دھیان میں رکھنی چاہیے وہ یہ کہ ضروری نہیں کہ کسی بڑے ادیب کی شخصیت میں بھی، ایک شخصیت نگار کے لیے بڑا پن ہو۔ برعکس اس کے ایک معمولی ادیب یا شخص میں سے بہت کچھ برآمد ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی عبدالحق کا مضمون نام دیو مالی زیادہ کامیاب ہے، بہ نسبت اُن مضمونوں کے جو انھوں نے بڑی شخصیتوں پر لکھے۔

ویسے یہ کہہ دوں کہ جتنا 'پیار' میں نے اپنے دوستوں سے کیا۔ کم کسی نے کیا ہوگا۔ میں نے دوستوں کے بارے میں جھوٹے مضمون نہیں لکھے کہ وہ

اچھائیوں کا بھی تاثر ختم کردیں۔ میرے دوست جیسے ہیں۔ میرے مضمون بھی ویسے ہی ہیں۔ میں نے اوروں کی طرح، اپنے دوستوں کو مخصوص اور ذہنوں کے حوالے نہیں کیا۔ میری تحریر میں خامی ہوسکتی ہے۔ میرے جذبہ میں نہیں۔

یہاں یہ بات صاف کردوں۔ صرف عیب جوئی شخصیت نگاری نہیں اور نہ ہی عیب پوشی کا نام شخصیت نگاری ہے۔ میرے نزدیک تو خوفِ خدا کے ساتھ، فن کارانہ عکاسی کا نام شخصیت نگاری ہے

ایک اور مثال سے اپنی سوچوں کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

جب انسان، شیر کا شکار کرتا ہے تو اُسے شکاری کہا جاتا ہے اور جب شیر انسان کا شکار کرتا ہے تو اسے درندہ کہا جاتا ہے۔ حالانکہ فعل دونوں کا ایک ہے۔ نام مختلف دے دیئے گئے ہیں۔ یہ کیوں؟ یہی میری شخصیت نگاری کا وہ بنیادی موڑ ہے۔ جس کی بنا پر مجھے کبھی کبھی مطعون بھی ہونا پڑا۔ مگر میں اس پر شرمندہ نہیں۔ میں تو ہر چیز کو اس کے اصلی نام سے پکاروں گا۔

ہر انسان کی نظر میں، انسانیت کا معیار صرف اس کی ذاتی خواہشیں ہوتی ہیں۔ مگر دوسروں کی نظر میں، اس کا عمل، اس کی انسانیت کا معیار ہوتا ہے یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں نے ذاتی خواہشوں کا خیال کبھی نہیں رکھا۔ بلکہ انسانیت کا معیار، اس کے عمل کو سمجھا۔ شخصیت نگاری میں ذاتی خواہشوں اور عمل کے ٹکراؤ میں، توازن کے برقرار رکھنے ہی کو، میں فن سمجھتا ہوں۔

آخر میں، مَیں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے ضرورتاً پورا اُردو ادب پڑھنا پڑا ہے۔ مَیں اگر اچھا لکھ نہیں سکا تو اچھی اور بُری تحریروں میں تمیز ضرور کر سکتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اپنا لکھا پسند نہیں۔ پسند آئے بھی کیسے؟ میرے نزدیک سُوئی کے ناکے میں سے اونٹ کو گزار دینا آسان ہے مگر ایک اچھا شخصی مضمون لکھنا مشکل ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ اس دُنیا میں ایک لاکھ ۲۴ ہزار پیغمبر آئے۔ ان سب کے نام کسی کو معلوم نہیں۔ اسی طرح مَیں بھی "دو لاکھ ۴۸ ہزار" ادیبوں میں آیا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ کل کلاں کو کوئی میرا بھی نام نہ جانے۔ مگر میرے لیے یہ احساس ہی بڑا قیمتی ہے کہ کل آنے والا ہے۔



زیدی صاحب

کسی نے میر تقی میرؔ سے پوچھا تھا — "کیوں حضرت آج کل شاعر کون ہے؟" کہا "ایک تو سوداؔ، دوسرا یہ خاکسار ہے!" اور تامل کر کے کہا۔ "آدھے[1] خواجہ میر دردؔ!" کوئی شخص بولا کہ "حضرت! میر سوزؔ؟" چیں بجبیں ہو کر کہا کہ "میر سوزؔ بھی شاعر[2] ہیں؟" انھوں نے کہا کہ "آخر استاد نواب آصف الدولہ کے ہیں!" کہا کہ "خیر! یہ ہے تو پونے تین سہی[3]!"

یہ تو قصہ پرانا تھا۔ نواب سائلؔ اور بےخودؔ دہلوی تو ابھی کے شاعر تھے۔ ان کا بھی ایک لطیفہ بہت مشہور ہے۔

بےخودؔ دہلوی نے فرمایا — "دلّی میں کُل دو شاعر ہیں۔ ایک مَیں،

---

[1] جسے آدھا شاعر کہا گیا ہے، اس کے ایک دو پورے شعر سن لیجیے : ؎

جو حسن رابی کہ دردؔ یہاں پھیلی — دستِ قدرت سے کب سمٹتی ہے

ہر چند نہیں صبر تجھے دردؔ و لیکن — اتنا بھی نہ ملیو کہ وہ بدنام کہیں ہو

[2] چوتھائی شاعر کا بھی ایک شعر سناؤں؟

گذرے دن ہوں جس خرابے پہ کہتے ہیں اس کے لوگ — ہے کوئی دن کی بات یہ گھر تھا، یہ باغ تھا

[3] آبِ حیات

دوسرا سائل! اور سائل بھی کیا!"

اور سنیے:

میر ۱۷۲۲ء میں پیدا ہوئے، غالب ۱۷۹۷ء میں، اقبال ۱۸۷۷ء میں،

یہ تھے شاعر!

محمد حسین آزاد ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے، مولانا حالی ۱۸۳۷ء میں، عبدالرحمٰن بجنوری ۱۸۸۵ء میں،

یہ تھے نقاد!

میر امن ۱۷۴۴ء میں پیدا ہوئے، رتن ناتھ سرشار ۱۸۴۷ء میں، پریم چند ۱۸۸۰ء میں،

یہ تھے کہانی نویس!

منشی سجاد حسین ۱۸۵۶ء میں پیدا ہوئے، فرحت اللہ بیگ ۱۸۸۶ء میں، پطرس ۱۸۹۸ء میں،

یہ تھے مزاح نگار!

مگر ۱۹۶۷ء میں!

جو شخص ایک مصرع موزوں کر لیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو میر سمجھتا ہے غالب سمجھتا ہے، اقبال سمجھتا ہے۔

جو شخص نہ مضمون لکھ سکتا ہے نہ شعر کہہ سکتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو آزاد سمجھتا ہے، حالی سمجھتا ہے، بجنوری سمجھتا ہے۔

جو شخص اپنی نانی اماں سے کہانیاں سُنا کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو میر امن سمجھتا ہے، سرشار سمجھتا ہے، پریم چند سمجھتا ہے۔

جو شخص اپنی بے وقوفی پر نہ رو سکتا ہے، نہ ہنس سکتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو منشی سجاد حسین سمجھتا ہے، فرحت اللہ بیگ سمجھتا ہے، پطرس سمجھتا ہے۔

آدمی ایک غالب کے سامنے، ایک آزاد کے سامنے، ایک پریم چند کے سامنے، ایک پطرس کے سامنے تو اپنے سر کو جھکا سکتا ہے، مگر اتنے غالبوں، اتنے آزادوں، اتنے پریم چندوں اور اتنے پطرسوں کے سامنے کیسے سر کو جھکائے۔

ریاکاری، میرے نزدیک دنیا کا بدترین فعل ہے۔ مگر یہ گناہ بھی کیا۔ جس نے کہا۔ "میں اس دور کا غالب ہوں۔" میں نے حیران ہو کر کہا۔ "بے شک!" جس نے کہا۔ "میں آزاد ہوں۔" میں نے سراسیمہ ہو کر کہا۔ "بلاشبہ" ــــ جس نے کہا۔ "میں پریم چند ہوں۔" میں نے خوف زدہ ہو کر کہا۔ "یقیناً" ــــ جس نے کہا۔ "میں پطرس ہوں۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "واللہ!"

یہ تھیں زیدی صاحب کے قبیلے کی باتیں!

انھوں نے نہ تو کبھی یہ کہا، اس وقت ملک میں کُل پونے تین شاعر ہیں، اور نہ ہی یہ کہا، اس وقت لاہور میں صرف دو شاعر ہیں، ایک میں، دوسرا فلاں! اور فلاں بھی کیا! ــــ پھر یہ کیسے شاعر ہیں؟ مجھے تو ان کے شاعر ہونے پر شبہ ہونے لگا ہے۔

شاعروں کی ایک لمبی فہرست میں مصطفیٰ زیدی کا دم بڑا غنیمت ہے۔ انھوں نے ہمیں مایوس نہیں کیا، بلکہ ان کا فن مسلسل ارتقا پذیر ہے۔ میری

ہموس کے مطابق تو ان کے شعروں نے اپنی انفرادیت اور اپنی مندرتا کی وجہ سے
ایک اُونچا مقام پالیا ہے جو قابلِ رشک بھی ہے اور قابلِ تقلید بھی!

معلوم ہوتا ہے، میں بھٹک گیا ہوں، اپنے موضوع سے ہٹ گیا ہوں۔
اس لیے مضمون کو پٹڑی پہ لاتا ہوں۔ یہ موضوع نقّادوں کا ہے، جو ادب
کی گاڑی کو چھکا چھک بھگائے جا رہے ہیں۔ کبھی وہ فرسٹ کلاس کے
مسافر کو تھرڈ کلاس میں بٹھا دیتے ہیں اور کبھی تھرڈ کلاس کے مسافر کو فرسٹ کلاس
میں، چونکہ یہ فن مجھے نہیں آتا، اس لیے کانٹا بدلتا ہوں۔

یہ جو مضمون میں یہاں پڑھ رہا ہوں، یہ کوئی اصلی تھوڑا ہے۔ اصلی
مضمون تو یار دوستوں میں بیٹھ کر، زبانی ہی سُنا سکتا ہوں، یہاں اگر میں نے
ایسی بے تکلفی برتی تو آپ مجھ سے بھی ناراض ہو جائیں گے اور زیدی صاحب
سے بھی۔ لہٰذا میں آپ کی خوشنودیٔ طبع کے لیے نقلی مضمون پڑھوں گا۔
میں نہ تو آ بیل مجھے مار کا قائل ہوں اور نہ ہی جا بیل اُسے مار کا قائل،
اس پر بھی اگر جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوں تو میرا کیا قصور؟

ادیب اور کچھ ہو یا نہ ہو، مگر وہ اپنے آپ کو سمجھتا بہت کچھ ہے۔
ادیب تو ادیب، میں نہ تینوں میں نہ تیرہوں میں، مجھ سے بھی جب یہ کہا گیا
کہ آپ مصطفےٰ[1] زیدی پہ ایک مضمون پڑھ دیں، تو میں نے کہا "سوچوں گا۔"

---

[1] یہ مضمون مصطفےٰ زیدی کے نئے مجموعہ کلام "قبائے ساز" کے افتتاح کے موقع پر پڑھا گیا۔

اسی سوچ میں، اس تقریب کا پروگرام چھپ گیا، اور اس میں میرا نام نہ آیا۔

جب اس تقریب کا پروگرام چھپ کر بٹ گیا، تو مَیں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ سوچا، چھوٹ گیا مگر نہ جانے منتظمین کو کیا سُوجھی کہ کارڈ تقسیم کرنے کے بعد بھی مجھ سے پوچھتے ہیں ـــ "کیا سوچا آپ نے؟"

اس پر بھی مَیں نے کہا، "سوچوں گا!"

پہلے سوچ یہ تھی کہ کون بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالے۔ پھر سوچ یہ تھی کہ موجودہ حالات میں مجھے لکھنا بھی چاہیے کہ نہیں!

ایک مرتبہ مَیں نے معاہدۂ تاشقند کے مسئلے پر سوچا تھا۔ یا پھر اب اس مضمون کے لکھنے کے مسئلے پر سوچا۔ ایک کو ہمارے پیارے صدر نے مان لیا تھا، ایک کو میں نے مان لیا۔

مَیں نے اس تقریب کے منتظمین سے کہہ دیا تھا کہ میں زیدی صاحب کو زیادہ نہیں جانتا؛ اس لیے مجھ سے ۲۱ توپوں کی سلامی والا مضمون لکھا نہ جائے گا۔

جواب ملا ـــ "زیدی صاحب تو آپ کو بھائی کہتے ہیں، اور آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ مَیں انھیں زیادہ نہیں جانتا"

یہ سُن کر مَیں زمین میں گڑ گیا۔ زیدی صاحب کی محبت نے پچھاڑ دیا۔ واقعی! خلوص اور محبت میں ان سے جیتنا مشکل ہے۔

یہ جب ہندوستان میں تھے اور ابھی پاکستان معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا،

اُن دنوں یہ کوئی طالب علم قسم کی چیز ہوں گے۔ یہ میں بات ۱۹۴۵ء کی کر رہا ہوں۔ اُس وقت یہ تیغ الہ آبادی تھے اور مَیں صرف پبلشر۔

ان کا خط آیا، جس میں یہ رقم تھا کہ ــــ "آپ جو فلاں مصنّف کی کتابیں دھڑا دھڑ چھاپ رہے ہیں، اُن میں کیا رکھا ہے! آپ کیوں لوگوں کا مذاق خراب کر رہے ہیں؟"

اُن دنوں میں نے سوچا تھا، یہ عجیب آدمی ہیں، مذاق لوگوں کا خراب ہو رہا ہے اور پریشان یہ ہیں۔ چنانچہ مسئلے کا حل مَیں نے وہی نکالا، جو افسران ٹاپ کے لوگ نکالتے ہیں ــــ یعنی نوٹس ہی نہ لیا جائے۔

ہاں تو صاحب! میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان کا وہ خط جو میرے نام ۱۹۴۵ء میں آیا تھا، اور جس کا مَیں نے یہ حل ڈھونڈھا تھا کہ نوٹس ہی نہ لیا جائے، اس کا حشر یہ ہُوا کہ اس خط کے کوئی پندرہ بیس روز بعد، ان کا پھر ایک خط آ دھمکا۔ جس میں دھمکی یہ تھی ــــ "اگر آپ نے میرے خط کا جواب نہ دیا۔ تو پھر مَیں اخباروں اور رسالوں میں مضمون لکھوں گا۔"

جب اس مضمون کا خط آیا، تو مَیں نے سوچا، یہ تیغ صاحب مجھے ضرور تہ تیغ کریں گے۔ چنانچہ اس خط کا مَیں نے جو جواب دیا، وہ کچھ یوں تھا ــ "اُس مصنّف کے سینکڑوں نہیں ہزاروں مدّاح ہیں مگر اُن میں آپ کا یہ مخالفانہ خط میرے لیے ہزاروں مدّاحین کے خطوط سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔"

تھوڑا سا مسکہ کام آگیا۔ پھر ان کا کوئی خط نہ آیا۔ میں نے بھی اللہ کا شکر ادا کیا۔

پھر تیغ الہ آبادی پاکستان آگئے۔ پھر مصطفیٰ زیدی بن گئے[1]۔ میں نے بھی اس عرصے میں، پر جھاڑ لیے تھے۔ نقوش میں ان کی نظمیں چھپنے لگیں، پیاری پیاری سی نظمیں۔ مگر میں نے دیکھا کہ ان کا ذہن وہی ہے، جس سے مجھے ۱۹۴۵ء میں واسطہ پڑا تھا۔ یعنی خلافِ طبیعت کسی بھی بات کو پسند نہ کرنا نہ صرف ناپسند کرنا، بلکہ اس کے خلاف احتجاج کرنا۔

یہ سوچتے یوں ہیں ؎

زمانہ یوں تو ہر اک پر نظر نہیں کرتا
قلم کی بے ادبی درگذر نہیں کرتا

فیصلہ یوں کرتے ہیں ؎

تمہیں نہ صرف شبستاں میں جا کے لکھنا ہے
ہر ایک عہد کے زنداں میں جا کے لکھنا ہے

غرض زیدی صاحب نے جتنی بھی شاعری کی ہے، وہ صرف احتجاج

---

[1] تیغ الہ آبادی اور مصطفیٰ زیدی کو، ان کے اپنے الفاظ میں بھی دیکھ لیجیے!
"تیغ الہ آبادی اور میں اب سے کچھ عرصہ پہلے تک ایک ہی تھے، لیکن آخر انھیں علیحدہ ہونا ہی پڑا۔ اس تخلص کی قصابیت کو میں نے بچپن کی غلطیوں میں شامل کر رکھا ہے۔"
(شہر آذر)

ہے۔ احتجاج ہی احتجاج ' اپنے خلاف احتجاج ' محبوب کے خلاف احتجاج ، معاشرے کے خلاف احتجاج ، حاکم بدہن حکومت کے خلاف احتجاج ؛ چونکہ یہ خود حکومت کا ایک اہم پُرزہ ہیں ' اس لیے حکومت کے خلاف جو ان کا احتجاج ہے ' وہ دراصل ان کا اپنے ہی خلاف احتجاج ہے۔ عموماً یہ ہوتا ہے کہ صاحبِ اختیار قسم کے لوگ خود احتسابی سے ڈرتے ہیں مگر ایسے جیوٹ کم ملیں گے جو سینہ تان کے کہتے ہوں — "ہم میں یہ بُرائی ہے - ہم میں یہ بُرائی ہے" اگر افسران میں قدرت اللہ شہاب ، مسعود مفتی اور مصطفےٰ زیدی ایسے لوگ نہ ہوتے تو پھر بسم اللہ کے گنبد میں زندہ باد کے کھوکھلے نعرے تو گونجتے ، لیکن صلِّ علیٰ کی آواز نہ آتی۔

بہت پہلے کی بات ہے ' دس بارہ برس پہلے کی ' کہ قدرت اللہ شہاب کی ایک تحریر پر ' میں نے ان سے گذارش کی تھی — "جناب ! احتیاط کیجیے - قلم منہ زور ہو گیا ہے۔"

جواب ملا — "حالات ہی تکلیف دہ ہیں ' آنکھوں پہ پٹی کیسے باندھوں؟"

میں نے کہا — "پھر بھی حوصلے سے —"

کہنے لگے — "میں جو کچھ محسوس کروں گا ' وہ لکھوں گا ' اور تم اسے چھاپو گے ۔ نتیجے میں حکومت تمھیں قید کر دے گی ، اور مجھے کسی اسکول کا ہیڈ ماسٹر بنا دے گی۔"

عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے شہ زور ہیں۔ ان کی سوچیں بڑی بے خوف ہیں۔ ان کے دل میں نا انصافی اور ظلم کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔

اب شہاب صاحب تو کچھ سنبھل گئے ہیں، لیعنی لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ زیدی صاحب اور مفتی صاحب بھی سنبھل جائیں گے۔ صرف شہاب صاحب کی عمر تک پہنچنے کا وقت درکار ہے۔

زیدی صاحب پاکستان آئے تو نہ جانے کہاں کہاں رہے۔ مجھے ان کے پشاور، سیالکوٹ، خیرپور، لاہور اور منٹگمری کے قیام کا تو علم ہے۔ خوب خط و کتابت تھی، اچھی خاصی دوستی تھی۔ زیدی بھائی! طفیل بھائی! یہ ہمارے سوچنے اور لکھنے کا انداز تھا۔

منٹگمری جانے سے پہلے، زیدی صاحب لاہور میں بھی کچھ عرصہ رہے محکمہ تعلیم میں، ان کی چیزیں نقوش میں چھپتی رہیں۔ رابطہ خط و کتابت کے ذریعے تھا۔ میں صاحب قسم کے لوگوں کو سلام کرنے کا عادی نہیں۔ برابری کے ساتھ کوئی ملے، تو بندہ غلام بھی ہے۔ یہی سبب تھا کہ یہ لاہور میں تھے۔ مگر میرے لیے لاہور میں نہ تھے۔

زیدی صاحب دوبارہ لاہور آئے۔ موجودہ عہدے پر، تو میں حسب عادت ان کی خدمت میں حاضری سے گریز کرتا رہا۔ یہ بات کو تاڑ گئے۔ ایک دن ان کا ٹیلیفون آیا — "میں آپ کے دفتر آنا چاہتا ہوں، اجازت ہے؟"

اجازت ہے' والی بات میں کچھ طنز بھی ہو گا۔ مگر انھوں نے میرے پاس تشریف لا کر ثابت کر دیا کہ یہ افسر ہی نہیں' آدمی بھی ہیں۔

پھر بیٹھتے ہی کہا — "بھئی کچھ کافی وافی کا انتظام کراؤ!"

فرمایش کر کے کافی پینا، خود چلے آنا۔ بظاہر یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں۔ میرے لیے ان میں بھولنے والی بھی کوئی بات نہیں، مگر صاحب بہادر قسم کے لوگوں کے لیے یہ باتیں بہت بڑی ہیں۔ یہ لوگ مرتے مرجاتے ہیں، مگر صاحب بہادری کو نہیں چھوڑتے۔

میری ان سے پہلی باضابطہ ملاقات بڑی غلط جگہ ہوئی۔ یہ اپنے سے بڑے' ایک افسر کے ہاں بیٹھے ہوئے تھے' بڑے صاحب کے پاس جا کر، متعلقہ چھوٹے افسر نے کہا — "جناب! مسمّیٰ محمد طفیل حاضر ہے!"

زیدی صاحب نے مسمّیٰ محمد طفیل کا نام سنا، تو چونکے۔

"بھئی، کون محمد طفیل؟"

"جی، وہ نقوش والے!"

"کیا کیا انھوں نے؟"

"جی، ایک فحش چیز چھاپی ہے!"

"اچھا! پہلے تم مسمّیٰ محمد طفیل کو اندر بلاؤ، ان کے لیے چائے لاؤ۔ اس کے بعد پھر کوئی بات ہوگی!"

چنانچہ مسمّی محمد طفیل جب کمرے میں داخل ہُوا، تو ایک صاحب اُٹھ کر گلے ملے ــــ "بھئی آپ سے بھی کہاں ملاقات ہُوئی، مَیں مصطفےٰ زیدی ہوں!"
یہ مصطفےٰ زیدی، اُس وقت منٹگمری کے ڈپٹی کمشنر تھے۔ بلکہ شنید یہ ہے کہ یہ اُس دن لاہور کی ڈپٹی کمشنری کا چارج لے رہے تھے۔

مَیں نے دیکھا کہ یہ ڈپٹی کمشنر سے ایک دم میرے وکیل بن گئے۔ جلدی جلدی ساری کارروائی پڑھی، "قابلِ اعتراض" عبارتوں کو پڑھا۔ فائل پڑھتے جاتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے "یہ لوگ آپ کے مرتبے سے واقف نہیں۔ کہاں گھسیٹ لائے آپ کو!"

کیس کی تیاری مکمل کر کے انھوں نے بڑے صاحب سے کہا، "مَیں نے سب کچھ پڑھ لیا ہے، اس میں کوئی چیز قابلِ اعتراض نہیں، بے شک مجھ سے بحث کر لی جائے!"

تھوڑی باتیں ہُوئیں، سرکاری زبان میں مقدّمے پر جرح ہُوئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میرا وکیل مقدمہ جیت گیا۔ یعنی زیدی صاحب مقدمہ جیت گئے۔

انھوں نے تو فائل پڑھتے ہُوئے میرے بارے میں یہ کہا تھا کہ ــــ "یہ لوگ آپ کے مرتبے سے واقف نہیں۔" اس عاجز کے مرتبہ ہی کیا! مگر مَیں خود زیدی صاحب کے مرتبے سے اُس دن واقف ہُوا۔

ایک دن مَیں ان کے پاس بیٹھا ہُوا تھا کہ ایک صاحب گھبرائے ہُوئے

آئے، ان سے کہا۔ "طالب علموں نے ہڑتونگ مچا رکھا ہے، تشدد پر آمادہ ہیں۔ بڑی مشکل ہے۔"

انھوں نے جواب دیا ___ "بچّوں کو پیار محبّت سے سمجھائیے۔ نادان ہیں۔ اپنا بُرا بھلا نہیں جانتے۔ مگر یہ بتائے دیتا ہوں، گولی کسی بھی قیمت پر نہیں چلائی جائے گی۔"

وہ صاحب کچھ کہنے ہی والے تھے کہ انھوں نے قدرے برہم ہو کر کہا "میں اس ضمن میں کچھ سننا نہیں چاہتا۔ گولی نہیں چلے گی۔ آخر ہم کس پر گولی چلائیں گے؟ اپنے بچّوں پر؟ اپنی اولاد پر؟"

جب اس نازک مرحلے پر بھی، مَیں نے ایک ڈپٹی کمشنر کے منہ سے یہ سُنا کہ ہم کس پر گولی چلائیں گے؟ اپنی اولاد پر؟ تو مَیں نے سوچا، یہ شخص تو پیار کے قابل ہے۔

یہ جو سی ایس پی یا پی سی ایس قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ اپنے وقت کے بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ کاروبارِ حکومت انہی کے دم سے چلتا ہے ان کے طمطراق کے کیا کہنے! خدا تک رسائی آسان، ان تک مشکل!

خیر سے زیدی صاحب سی ایس پی ہیں۔ سرکاری طور پر، ان کے ٹھاٹ باٹ، زیادہ سے زیادہ پنشن پا لینے تک ہوں گے۔ اس کے بعد انھیں کوئی نہ پوچھے گا۔ اگر کسی رشتے سے انھیں پوچھا جائے گا۔ تو وہ

رشتہ ادب کا ہوگا۔ ہمارے دلوں میں، ان کے اس رشتے کی وجہ سے آج بھی قدر ہے، کل بھی ہوگی۔ جو رفتار میں ان کی دیکھ رہا ہوں، اگر یہ اسی لٹک اور اسی لگن سے آگے بڑھتے رہے تو عجب نہیں انھیں دائمی زندگی مل جائے۔

یہاں میں سر عبدالقادر کی مثال پیش کروں گا۔ وہ سرکاری حیثیت سے بہت بڑے افسر تھے۔ کوئی بڑا سرکاری عہدہ ایسا نہ تھا جو ان کی جھولی میں نہ ڈالا گیا ہو۔ وہ بھی انگریز بہادر کے زمانے میں، وزیرِ تعلیم بھی رہے، جج بھی رہے، ہائی کمشنر آف انڈیا اِن لندن بھی رہے، بعد میں بہاول پور کے چیف جسٹس بھی رہے۔ اور نہ جانے کیا کیا رہے مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ اپنی سرکاری حیثیت سے گم ہو رہے ہیں۔ مگر ان کی جو ادبی حیثیت تھی، اسے کوئی ضعف نہیں پہنچا۔ سر عبدالقادر آج بھی ڈاکٹر اقبال کے دیباچہ نگار کی حیثیت سے زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ وہ آج بھی مخزن کے ایڈیٹر کی حیثیت سے زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ حتیٰ کہ سر عبدالقادر کی قبر پر جو کتبہ لگا ہوا ہے اس پر یہ لکھا ہوا نہیں ہے کہ وہ فلاں فلاں بڑے سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔ بلکہ اس پر لکھا ہوا ہے تو یہ — مرقد، سر عبدالقادر، ایڈیٹر مخزن!

مزید بر آں، میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں — آپ مجھے میرؔ کے زمانے کے کسی حاکمِ شہر کا نام بتائیں؟ آپ غالبؔ کے زمانے کے کسی بڑے عہدے دار کا نام بتائیں؟ دور نہ جائیں، آپ مجھے داغؔ کے زمانے کے کسی ڈپٹی کمشنر کا نام بتائیں؟ اس کے برعکس، اگر آپ مجھ سے یہ کہیں کہ

میرؔ کے زمانے کے شاعروں کے نام بتاؤ؟ غالبؔ کے زمانے کے شاعروں کے نام بتاؤ تو مجھے کوئی دقت نہ ہوگی۔ صفِ اوّل کے شعرا کا ذکر چھوڑیئے میں آپ کو، اس دور کے دوسرے اور تیسرے درجے کے شعرا کے نام بھی بتا دوں گا۔

ادیب جو آپ کو خستہ حال اور ناآسودہ نظر آتے ہیں، یہ لوگ تاریخ کی نظر میں بڑے باوقار ہیں۔ مستقبل انہی کا ہے، تاریخ کے صفحات میں انہی کے نام تابندہ ہوں گے ـــ تاریخ یا تو غداروں کو یاد رکھتی ہے یا اپنے محسنوں کو۔ خستہ حال سے یاد آیا۔ آج اس ہوٹل دانشر کانٹی نینٹل میں آنے کے لیے بہت سے ادیبوں کے پاس کپڑے نہ تھے جنہیں وہ پہن کر یہاں آسکتے معلوم ہوا کہ اس جگہ داخلہ یا تو مغربی لباس میں ممکن ہے یا نیشنل ڈریس میں۔ جس ملک کے نوّے فی صد عوام بھوکے ہوں تن پر کپڑا نہ ہو انھیں یہ نیشنل ڈریس قسم کی باتیں زیب نہیں دیتیں۔

میں تو یہ کہتا ہوں، اگر لوگ واقعی یہاں نیشنل ڈریس میں آگئے۔ تو آپ لوگ کرسیاں چھوڑ کر بھاگ جائیں گے، اس لیے کہ ملک کے عوام کا نیشنل ڈریس تو نیچرل ڈریس ہے۔ باقی رہا مغربی لباس، اسے ضرور اپنائیے، بھلا لباس ہے۔ مگر وہ بات ضرور یاد رکھیے کہ یہ اُس قوم کا لباس ہے، جس نے برابری کا درجہ نہیں دیا تھا، بلکہ وہ آپ کو ہیچ خیال کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے کئی پبلک مقامات پر یہ بورڈ لگا رکھے تھے ـــ

Dogs or Indians are Not Allowed.

اب آپ لوگ آزادی کے بعد بھی مغربی لباس اور نیشنل ڈریس کی پخ لگا کر، کیا ہمیں یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ ـــــ

Pakistanis are Not Allowed

پہلے شخصیت نگار بڑے بھلے لوگ تھے۔ انھوں نے کبھی بھی اس امر کی کوشش نہیں کی کہ شخصیت کو ان کی تحریروں میں بھی ڈھونڈھ لیا جائے۔ مگر میری ناچیز رائے میں یہ بھی ضروری ہے۔

میرے لیے یہاں دقت یہ ہے کہ آپ گھر سے لائٹ قسم کا موڈ لے کے آئے ہیں۔ اگر میں نے یہاں کچھ جتن کرکے زیدی صاحب کو، ان کے شعروں سے برآمد بھی کرلیا، تو ہوسکتا ہے کہ آپ میں سے، بہت سے دوست یہ کہہ دیں "یہ زیدی صاحب نہیں ہیں" امتحان یہ بھی ہے کہ خود زیدی صاحب کہہ دیں ـــــ "یہ میں نہیں ہوں"

مثال کے طور پر میں یہ کہتا ہوں کہ جب یہ محبوب کی گلی میں جاتے ہیں تو کہتے ہوئے یہ جاتے ہیں ؎

بہت سے آئے ہیں تیری گلی میں لیکن میں
متاعِ عزتِ ساداتِ لے کے آیا ہوں

تو بہت سے سید زادوں کو غیرت ہوگی۔ وہ کہہ سکتے ہیں "اچھا! متاعِ عزتِ سادات

بھی دے ڈالی!

بنتِ حوّا سے ان کا سلوک بڑا متضاد ہے ۔ غرض جیسا وقت پڑا ، نبھاہ ڈالا ۔ یہ صلحِ کُل قسم کی پالیسی بڑی سکون بخش ہے ۔ ابھی آپ نے دیکھا کہ عزّتِ سادات لے کے محبوب کی گلی میں گئے تھے ۔ جب سب نے انھیں اُس گلی میں دیکھ لیا تو انھوں نے ٹھٹھک کر، خوبصورت انداز میں بہلا دیا ۔ سمجھایا، مَیں ان میں سے نہیں ہوں ؎

اک پیشۂ عشق تھا سو عوض مانگ مانگ کر
رُسوا اُسے بھی کر گئی سوداگروں کی ذات

جب یہ فلسفہ بگھار رہے تھے، تو دُور کھڑے ایک لنگوٹیے یار نے آواز دی؛ کل تک تو یہ کہتے تھے ؎

زندگی جسم کی خواہش کے سوا کچھ بھی نہیں
خون میں خون کی گردش کے سوا کچھ بھی نہیں

بہرحال! ہمارے آپس کے اور اس قسم کے ذہنی جھگڑوں میں خطرہ یہ ہے کہ کہیں آپ کے چہرے نہ اُتر جائیں، پھول سے چہروں کا یہ حشر مجھے پسند نہیں ۔ مَیں کہوں، مَیں نے زیدی صاحب کو، ان کے اشعار سے یہ پکڑا، وہ پکڑا ۔ اور آپ کہیں، کہیں بھی نہیں پکڑا، لہٰذا وقت ضائع کرنے کا فائدہ ؟

بہتر یہ ہوگا کہ انھیں پہچاننے کا کام خود سنبھال لیجیے، تاکہ ذرا میں آگئے

بڑھ سکوں ۔ اگر آپ کی زیدی صاحب سے تھوڑی سی بھی جان پہچان ہے تو پھر یہ دیکھیے کہ آپ میں تھوڑی سی جہاں دیدگی ہے کہ نہیں؟ کچھ خلوص ہے کہ نہیں؟ کچھ حساس ہیں کہ نہیں؟ کچھ احساسِ جمال ہے کہ نہیں؟ اگر یہ دولت آپ کے بھی پاس ہے تو پھر آئینہ آپ کے رُو برو ہوگا، اور آپ آئینے کے رُو برو ہوں گے۔

میرا عجز یہ ہے کہ اس کسوٹی پر مَیں خود پورا نہیں اُترتا۔ اس لیے زیدی صاحب کو پہچانوں، تو کیسے پہچانوں؟ ——— اس لیے دامن بچا کے نکل آیا ہوں۔ مَیں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مَیں اس معیار پر پورا نہیں اُترتا اگر یہ کچھ بھی میرے پاس ہوتا، تو جتنی جان اب مصیبت میں ہے، اس سے سوا ہوتی۔ سولی پر لٹکنا آسان ہے، حساس بن کر جینا مشکل ہے۔

اُفوہ! مَیں بھی کہاں نکل آیا۔ مجھے احساس کی وادیوں میں گم ہونا بھی نہیں چاہیے۔ ہاں تو صاحب! میں بات مصطفیٰ زیدی کی کر رہا تھا۔ مگر دھیان اپنا آ گیا۔ مَیں اپنے آپ کو کہاں چھوڑ آؤں؟

زیدی صاحب نے جب اپنی کتاب "قبائے ساز" پر مجھے یہ شعر لکھ کر دیا ؎

تابش بھتے احتساب ہے جب سارے بادہ کش
مجھ کو یہ افتخار کہ میں مے کدے میں تھا

تو مَیں زیدی صاحب کے اُل بِل پر بڑا خوش ہوا۔ یہ افتخار، یہ غرور، یہ گھمنڈ،

مجھے بڑا ہی بھایا۔ جب مَیں نے اس شعر کے دریچے سے، زیدی صاحب کو جھانکا تو مجھے ان کی شخصیت اور بھی زیادہ پیاری معلوم ہوئی۔ پھر جب مَیں نے اس شعر کی اوٹ سے باقی کتاب کو پڑھا تو کچھ اور ہی لطف آیا۔ یہ شعر ان کی شخصیت کی تصویر ہے، یہ شعر ان کے کلام کی تفسیر ہے۔

آخر میں، میرا ایک مشورہ سُن لیجیے! — زیدی صاحب سے دوستی نہ کیجیے گا۔ نہ ہی ان کا کلام پڑھیے گا۔

دوستی نبھانا مشکل کام ہے، کلام پڑھیں گے تو پڑھتے ہی رہیں گے — ایسی صورت میں لوگ خبطی کہیں گے۔

خبطی کے لفظ پر ناراض نہ ہوجیے گا۔ دیکھیے داد یوں بھی دی جاسکتی ہے فراقؔ، غالبؔ کے بارے میں کہتے ہیں کہ غالبؔ ایک ایسا پاجی شاعر تھا کہ جس شاعر نے بھی غالبؔ کی نقل کی، وہ غالبؔ کا تو کچھ بگاڑ نہ سکا، کچھ اپنا ہی بگاڑ بیٹھا۔

زیدی صاحب کے بارے میں، مَیں نے جن باتوں کا دانستہ ذکر نہیں کیا، ان کا حال آپ بھی سننے پر اصرار نہ کریں، ویسے اس کہانے میں، مَیں آپ کو جوشؔ کا ایک شعر سناتا ہوں ؎

کھُل کر کہوں تو کفر کے فتوے لگائے خلق
وہ ارتقائے نوعِ بشر دیکھتا ہوں مَیں



شاہد احمد دہلوی

شاہد احمد دہلوی، اِس دنیا میں موجود نہیں۔ اس لیے ان پر مضمون لکھنے کا مزا کیا؟ دوستانہ چہلیں، زندوں ہی کے ساتھ بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ مذہب بھی یہ کہتا ہے کہ مرنے والوں کو اچھے نام سے یاد کرو۔ اس اعتبار سے مَیں سمجھتا ہوں کہ شاہد صاحب نے مر کر، میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔

ارے، یہ کون چلا آرہا ہے۔ شاہد صاحب معلوم ہوتے ہیں۔ وہی سانولا رنگ، وہی قدرے چپٹی ناک، وہی آنکھوں پہ عینک، وہی سر پہ ٹوپی، وہی شیروانی، وہی متوازن قد، وہی چال!

نہیں یہ وہ تو نہیں، مگر کچھ پھبن ویسی ہی تھی۔ ناک نقشہ ویسا تھا۔ طنزیہ مسکراہٹ اُنہی جیسی تھی۔ وہی ہوتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

زندگی میں ہزاروں لوگ ملتے ہیں۔ مگر ایسے کم ملتے ہیں۔ جن کی ہم عزت کرتے ہیں۔ شاہد صاحب ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔

زمانہ ۱۹۴۶ء کا ہے۔ میٹھی زبان میں، دو اشخاص کے درمیان

گفتگو ہو رہی ہے۔ کون کون ہیں یہ، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ البتہ یہ یاد ہے کہ مَیں صرف گفتگو کے سحر کی بنا پر، ایک کونے میں کھڑا ہو کر باتیں سننے لگ گیا تھا۔ عجیب موہنی باتیں تھیں۔

۱۹۴۸ء میں وہی صاحب مجھے لاہور کے ایک ہوٹل میں ملے۔ کسی نے تعارف کرایا۔ "یہ شاہد احمد دہلوی ہیں۔" مجھے فوراً جامع مسجد دلّی کے سامنے والی دکان یاد آ گئی۔ جس میں یہ حضرت بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ رسالہ "ساقی" کے مدیر، اُس وقت کے بڑے معروف آدمی تھے۔

اتفاق کی بات کہ جس ہوٹل میں جا کر ہم بیٹھا کرتے تھے۔ اُسی میں شاہد صاحب بھی باقاعدگی سے آنے لگے۔ تعلقات صرف سلام دعا تک رہے۔

کچھ عرصے کے بعد، شاہد صاحب پھر اُس ہوٹل میں نظر نہ آئے۔ مَیں نے ان کے ساتھی سے، جو ویسی ہی شیروانی پہنتے تھے پوچھا۔ "شاہد صاحب نظر نہیں آتے؟"

جواب ملا۔ "کراچی چلے گئے ہیں۔ اب وہیں سے پرچہ نکالیں گے۔ کیونکہ پنجاب گورنمنٹ نے مسلسل آٹھ ماہ کی جدوجہد کے بعد بھی، انھیں یہاں سے پرچہ نکالنے کی اجازت نہیں دی۔"

۱۹۵۰ء میں، مجھے بھی سُرخاب کا پَر لگ گیا۔ یعنی نقوش کی ادارت میرے حصے میں آئی۔ مَیں نے بھی اُنھیں اپنا رسالہ بھیجا۔ رسید کے طور پر،

جو ان کا خط ملا تھا۔ اُس میں انھوں نے کچھ مبالغے ہی کے ساتھ، رسالے کی تعریف کی تھی۔ ہمعصر جب کسی کے لیے کلمۂ خیر کہتا ہے تو اسے کم اہمیت والی بات نہ جانیے۔ کسی کی تعریف کرنے کے لیے شرافت، دیانت اور حوصلہ چاہیے۔ اس اعتبار سے شاہد صاحب اُونچے انسان تھے۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ انھوں نے میری کوئی فرمایش رد کی ہو۔ مَیں نے انھیں جب بھی پکارا۔ اُنھوں نے ہمیشہ لبیک کہا۔ جتنے مضمون شاہد صاحب کے نقوش میں چھپے ہوں گے اُتنے شاید ہی کسی دوسرے رسالے میں چھپے ہوں۔ لطیفہ یہ کہ انھوں نے اپنے ہی بعض مضمون نقوش سے ساقی میں نقل کیے۔ ایسے ایثار کی مثال شاذ ملے گی۔ جو اپنی صلاحیتوں کو دوسروں کے لیے مقدم اور اپنے لیے مؤخر جانتے ہوں۔ جب کہ آپ کاج مہاکاج میں ساری ہی دنیا مُبتلا ہو۔

شاہد صاحب میرے ساتھ بڑا خلوص برتتے تھے۔ بڑی محبت کرتے تھے مگر ایک موقع پر یہ ہُوا کہ اُن کا قلم میرے خلاف حرکت میں آگیا چنانچہ وہ وہ فقرے بازی ہُوئی اور وہ وہ طعن و تشنیع کے تیر برسائے گئے کہ توبہ ہی بھلی۔ مَیں اقرار کرتا ہوں کہ مَیں دوسروں کو بُرا بھلا کہنے میں اُتنا ماہر نہیں۔ جتنا کہ شاہد صاحب تھے۔

قصہ یہ تھا کہ انتخابی پرچوں کے خلاف، ادبی پرچوں کے مدیرانِ کرام

نے ایک جائز قسم کی مہم چلائی تھی۔ جس میں مولانا صلاح الدین احمد ایسے بزرگ بھی شامل تھے اور مجھ ایسے خورد بھی، وہ مہم یہ تھی کہ انتخابی پرچوں کے مدیران، مصنّف اور مُدیر سے اجازت لیے بغیر، کسی تخلیق کو اپنے رسالے میں نقل نہ کریں۔ چونکہ ایک پرچے پر شاہد صاحب کا نام چھپتا تھا۔ اس لیے وہ میدان میں کُود پڑے۔ ہم دلیلیں دیتے تھے۔ وہ فقرے بازی کرتے تھے ہم اصول اصول پکارتے تھے۔ وہ ہمیں سمجھاتے تھے۔ میاں! اصول کیسا؟ یہ دَور جس کی لاٹھی، اُس کی بھینس کا ہے۔ غرض وہ اپنی زبان دانی اور فقرے بازی کے بل بوتے پر جھوٹا مقدمہ بھی جیت گئے۔ اُن کے حصّے میں "مقصد براری" آئی۔ ہمارے حصّے میں "محض اصول!"

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اتنے بھلے آدمی کا آخر یہ رُخ کیا ہے؟ تھا صاحب یہ بھی اُن کی شخصیت کا ایک رُخ، ادبی خلیفہ تو وہ تھے ہی، تھوڑی سی دریائی میں ہوا سے باتیں کرنے لگ جاتے تھے۔ ویسے بھی معرکہ آرائی کو، اُن کے مزاج سے نسبت تھی بھی!

یہ باتیں وہ ہیں کہ جو میں نے شاہد صاحب کی زندگی میں بھی اُن سے کہی تھیں۔ میرے نزدیک کسی کا اِس دنیا میں ہونا یا نہ ہونا، صداقتوں کے اظہار کے سلسلے میں روک نہیں بن سکتا۔ شاہد صاحب کے ایسے جتنے بھی معرکے ہوئے۔ وہ ہم "بے زبان" پنجابیوں کے ساتھ، مگر آخر میں وہ اس

داغ کو دھو گئے۔ جوش ملیح آبادی کے خلاف نمبر نکال ڈالا۔

یہ طنطنہ ان کا یونہی تو نہ تھا۔ کسی بنیاد پر استوار تھا۔ ۱۹۵۹ء میں رائٹرز گلڈ بنا تو یہ اس کے کرتا دھرتا، ۱۹۲۶ء میں سجاد ظہیر اور اختر حسین رائے پوری کے اشتراک سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی دہلی میں شاخ قائم ہوئی تو یہ اس کے سیکرٹری، ۱۹۴۲ء میں کرشن چندر اور واتسین کے ساتھ مل کر، دلّی کی ہارڈنگ لائبریری میں آل انڈیا رائٹرز کانفرنس کا انعقاد ہوا تو وہ ان کی توجہ سے، ۱۹۳۶ء کے لگ بھگ ادب میں تجدّد کا غلغلہ بلند ہوا تو شاہد صاحب پیش پیش، جو شخص اس حد تک ادبی چودھری ہو۔ وہ کسی کی سُنے بھی کیوں؟ یہی وجہ تھی کہ وہ اس کے حق دار بنتے کہ جدھر سے بھی گزریں۔ لوگ یہی کہیں باادب باملاحظہ ہوشیار!

پرکھ کا وقت آیا تو بھی ان کے قدم پیچھے نہ ہٹے، عصمت چغتائی کی "چوٹیں" اور سعادت حسن منٹو کا "دھواں" شائع کرنے پر لاہور میں مقدمہ چلا۔ دہلی سے ۱۳ تیرہ مرتبہ لاہور آنا پڑا۔ وہ بھی پورے اسٹاف کے ساتھ، مگر ان کے ماتھے پر تیوری نہ تھی۔ ہٹ کے پکے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ شوربے کو چپاتی چوس نہ سکی۔

۲۲ رمئی ۱۹۰۶ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں والدہ کا انتقال ہوگیا۔ والد نے ان کی دیکھ بھال کے لیے یورپین گورنرس رکھی۔ جس کی وجہ سے

ان کی بنیادی انگریزی اچھی ہو گئی اور یہ بھی کہ اس زبان سے لگاؤ پیدا ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ قلم اُٹھاتے تھے اور انگریزی مضامین کا ترجمہ کر ڈالتے تھے۔ ترجمہ کرنا خالہ جی کا گھر نہیں۔ بڑے بڑے مار کھا گئے۔ مگر انھوں نے درجنوں ہی کتابوں کا ترجمہ کر ڈالا۔ وہ بھی اصل کی روح کو سمجھ کر، اپنی دل نشین اُردو میں ترجمہ اُردو میں یا تو عنایت اللہ دہلوی کا لطف آیا یا پھر ان کا، باقیوں نے تو وقت گزارنے کے لیے ترجمے کیے مگر مولوی مدن والی بات پیدا نہ ہوئی۔ یا اگر کسی نے اچھا ترجمہ کیا بھی، تو وہ بھی ایک آدھ کتاب کا، جیسے مولوی ظفر علی خاں نے، عبدالمجید سالک نے، ڈاکٹر عابد حسین نے، پطرس بخاری نے، یہاں بحث معیار اور مقدار دونوں سے ہے۔

ہاں تو ذکر، ان کے بچپن اور ان کی تعلیم کا ہو رہا تھا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم حیدر آباد دکن میں پائی۔ پھر علی گڑھ میں، میٹرک عربک اسکول دلّی سے کیا۔ لاہور کے ایف سی کالج سے ایف۔ ایس۔ سی کیا۔ آخر میں مشن کالج سے بی اے آنرز کی ڈگری لی

شاہد صاحب کے بہنوئی، ڈاکٹر اجمل حسین صاحب کنگ ایڈورڈ کالج (لاہور) میں پروفیسر تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ شاہد میاں ڈاکٹر بنیں۔ تھوڑا عرصہ پڑھا بھی، چونکہ یہ بنیادی طور پر بے حد رقیق القلب تھے۔ اس لیے مُردوں کی چیر پھاڑ سے بھاگے۔ بھاگے بھی ایسے کہ دلّی جا کر دم لیا۔

جن دنوں یہ دہلی کے مشن کالج سے ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے درپے تھے۔ انہی دنوں، انھوں نے اپنا رسالہ "ساقی" جاری کیا غالباً سنہ ۱۹۳۰ء میں، جب سے آخری دم تک، ادب کے ساتھ اپنا رشتہ نباہا۔ نہ صرف نباہا بلکہ حق ادا کیا۔

رسالہ نکالنے کا تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ "مالی خدائی مار" چنانچہ جیسے جیسے ساقی لوگوں کی نظروں میں چڑھتا گیا۔ توں توں جمع جتھا ختم ہوتا چلا گیا۔ ایک دن شاہد صاحب کے ماموں (جن کے پاس ساقی کے مالی امور تھے) سید اشتیاق حسین چشتی نے بتایا۔ برخوردار تم نے باوا جان کی اتنی دولت، اب تک برباد کر دی ہے۔ سنبھل جاؤ۔ ورنہ ہوا کھاؤ۔

تب شاہد صاحب کے دوستوں کی کابینہ بیٹھی۔ غور و خوض ہوا۔ طے یہ پایا کہ رسالے کے ساتھ پبلشنگ ہاؤس کا بھی کام کیا جائے۔ بڑے بڑے ادیب گھر کے تھے۔ پرانے اور اچھے لکھنے والوں سے شاہد صاحب کے مراسم تھے، بلکہ جن نئے لکھنے والوں کا سکہ رواں تھا۔ اُن میں سے بیشتر کو ساقی نے اُجالا تھا۔

یوں کہیں جا کر رسالے کے سنبھلنے کے آثار پیدا ہوئے۔ کتابیں بھی چھپتی رہیں۔ رسالہ بھی نکلتا رہا۔ اُن دنوں ترقی پسند ادب کا طوطی بول رہا تھا۔ شاہد صاحب ایسے لٹریچر کے رسیاؤں میں سے تھے۔ لہذا خوب کاروبار چمکا۔

ادیبوں کی بھی خدمت ہوئی۔ ادب کی بھی!

پاکستان بنا تو یہ صرف اپنا قلم اٹھا کر اِدھر چلے آئے تھے۔ بنی تو دال روٹی کے چکر ہیں، اُسی قلم کو گھساتے رہے۔ آخری دم تک اُسی کی روٹی کھائی۔ سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے، جب ادھر پبلشنگ ہاؤس کا کام نہ چلا تو انھوں نے سوچا مستحق ادیبوں کو یا اُن کے ورثا کو کتابوں کے حقوق لوٹا دیے جائیں۔ تاکہ انھیں کچھ مالی آسودگی ہو جائے اور کتابیں بھی بازار میں آجائیں۔ یہ حوصلہ بھی کسی کسی کا ہوتا ہے کہ اپنی خریدی ہوئی چیز کو کوئی یوں بغیر داموں واپس کردے۔ اس موضوع پر کسی نے ان سے بات کی بھی تھی۔ جواب میں انھوں نے کہا تھا کہ پاکستان آکر مجھے معلوم ہوا ہے کہ غربت کیا چیز ہوتی ہے۔ میرے پاس اور تو کچھ ہے نہیں۔ یہی کتابوں کے حقوق ہیں۔ سوچا، یہی ساتھیوں کو واپس کردوں۔

انھیں ادبی ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے تھے۔ جغادری ادیب کے پوتے، پھر بشیرالدین احمد کے صاحبزادے! جن کی ادبی حیثیت نہ صرف مسلّم تھی بلکہ حد درجہ واجب التعظیم بھی، انھوں نے "واقعات دار الحکومت دہلی" ایک ایسی کتاب (تین جلدوں میں) لکھ دی ہے کہ کہا کوئی اس سے بہتر لکھ سکے گا۔ یہ اکیلی کتاب ہی ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جو بڑی لمبی زندگی پائے گی۔ دلّی پر کچھ لکھنے کے لیے اس

کتاب کو بھولنے والا ٹھوکر کھائے گا۔ موتی نہ رولے گا۔

پھر اسی قسم کی ایک اور کتاب "تاریخ بیجاپور" لکھی۔ اس کا بھی حق ادا کیا۔ مگر یہ کوشش "واقعات دار الحکومت دہلی" سے بالاتر نہیں، فروتر ہے مگر اس فروتر کا بھی مرتبہ یہ ہے کہ اس سے بڑھ کر کوئی کچھ کہنے والا پیدا ہوگا تو اسے لوہے کے چنے چبانے ہوں گے۔ اسی طرح کا ان کا ایک اور کارنامہ "فرامینِ سلاطین" ہے جو مغل بادشاہوں کے فرامین پر مشتمل، ایک قیمتی دستاویز ہے۔

باپ نے (ڈپٹی نذیر احمد نے) مراۃ العروس لکھی تو بیٹے نے (بشیر الدین احمد نے) بھی اُسی طرز پر "اقبال دلہن" لکھی۔ بشیر الدین جو کچھ بھی تھے۔ اپنی جگہ بھاری پتھر تھے مگر ڈپٹی نذیر احمد تو نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ "اقبال دلہن" کو زیادہ شہرت کے پَر نہ لگے۔

بشیر الدین احمد نے اور بھی کئی کتابیں لکھیں۔ چند ایک کے نام لکھتا ہوں۔ میرا موضوع ریسرچ گھارنا نہیں۔ اس لیے زیادہ گہرا غوطہ لگانے کا ارادہ نہیں مگر پس منظر کے طور پر کچھ عرض کرنا ہی تھا تاکہ شاہد صاحب کی پشت پر ذہانتوں اور کاوشوں کا جو بوجھ لدا ہُوا تھا وہ تو نظر آتا۔

ہاں تو مَیں یہ کہہ رہا تھا کہ بشیر الدین احمد نے اور بھی کتابیں لکھیں ایک خاص خاکے کو ذہن میں رکھ کر، محض معاشرے کی اصلاح کی خاطر

ذہنوں کے جلا کی خاطر، بچوں کے لیے جو کتاب لکھی۔ اس کا نام تھا "حرزِ طفلاں"۔ جوانوں کے لیے جو کتاب لکھی۔ وہ تھی "نشاطِ عمر"، بوڑھوں کے لیے جو کچھ لکھا وہ تھا "عصائے پیری" کے نام سے!

اور ہاں یہ بات تو بھول ہی گیا کہ بشیرالدین احمد باپ کی طرح شعر بھی کہتے تھے۔ "دیوانِ بشیر" ان کی منظومات کا مجموعہ ہے۔

اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی ہے۔ جب دیوانِ بشیر چھپ کر آیا تو گھر میں باتیں ہونے لگیں۔ دیوانِ بشیر آ گیا۔ دیوانِ بشیر آ گیا تو ان کی بچی نے شاہد صاحب کی بہن نے) کہا۔ "ہمارے ابا دیوانے کیوں ہونے لگے کہنے والا ہی دیوانہ ہوگا۔"

عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ شاہد احمد ڈپٹی نذیر احمد کا پوتا تھا۔ جس نے درجنوں زندہ کتابیں لکھیں۔ جب تک اردو زندہ ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کی تحریریں روشنی دیتی ہی رہیں گی۔ لوگ فیض پاتے ہی رہیں گے۔ ان کے بیٹے نے جو کچھ لکھا وہ باپ سے کمتر درجے کی تحریریں ہیں، مگر زندہ وہ بھی رہیں گی۔ کم از کم تاریخی نوعیت کے کام، اصلاحی سلسلے کی تحریریں مار کھا جائیں تو کھا جائیں۔ پوتے نے جو کچھ لکھا۔ وہ نہ باپ کی ٹکر کا ہے اور نہ دادا کی ٹکر کا، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں، ان کی تحریروں کی قیمت پڑ رہی ہے۔

ستم کی بات یہ بھی ہے کہ شاہد صاحب پر اس خاندان کی علم وفن والی برتری بھی ختم ہوگئی۔ شاہد صاحب کی اولاد میں مجھے تو کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو قلم تھام کے کہہ دے کہ مَیں ابھی زندہ ہوں۔

مَیں نے سنا ہے کہ شاہد صاحب موسیقی کے بھی بڑے اُستاد تھے۔ مجھے نہ تو اس فن کی شُد بُد اُس وقت تھی اور نہ آج ہے۔ اس لیے مَیں ان کے مرتبے کو نہیں جان سکتا۔ کچھ عرصہ پہلے لاہور میں فنِ موسیقی پر ایک مذاکرہ ہُوا تھا۔ شاہد صاحب کو خاص طور سے کراچی سے بلایا گیا۔ جس سہ پہر کو انھوں نے مقالہ پڑھنا تھا۔ اس کی صبح مجھ سے فرمایا۔ میں مقالہ پڑھ رہا ہوں۔ پاکستان کونسل پہنچنا۔ اُس وقت میں نے اُن کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا تھا۔ جیسے کوئی مظلوم یہ سمجھا رہا ہو۔ میری جان بخش دیجیے۔ مجھے کوئی اور سزا دے دیجیے لیکن موسیقی پر مقالہ نہ سنوائیے مگر وہ نہیں ماننے تھے۔ وہاں ایک مقالہ چھوڑ کئی مقالے سننے پڑے۔ مضمون نگار مقالہ پڑھتا تھا۔ سامعین سوالات کرتے تھے۔ (سوالات نہیں اعتراضات) جن کا جواب دینا پڑتا تھا، شاہد صاحب پہلے تو اعتراضات کے جوابات دیتے رہے۔ پھر قدرے "سُرخ رُو" ہو گئے۔ بعد میں مجھے کہا۔ سب ... ... اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ کیا جانیں موسیقی کس چڑیا کا نام ہے۔

ان کے اس شوق کے متعلق معلوم یہ ہوا کہ انھوں نے مذاق ہی مذاق

میں گانا سیکھا تھا۔ وہ یوں کہ چند دوست بیٹھے تھے۔ ایک دم ترنگ میں آگئے۔ انصار ناصری نے کہا۔ میں طبلہ بجاتا ہوں۔ شاہد احمد دہلوی نے کہا میں ہارمونیم بجاتا ہوں۔ کسی نے کہا۔ میں گاتا ہوں۔ یوں چوکی پوری ہو گئی۔ سا۔ رے۔ گا۔ ما۔ پا۔ دا۔ نی۔ سا شروع، تک دیا، تک دیا چالو!

کیا معلوم تھا کہ وقتی اُبال رنگ لائے گا۔ جوں جوں مذاق بڑھتا گیا۔ یہ گویّے بنتے چلے گئے۔ ایک وقت وہ آیا کہ لوگوں نے محسوس کیا کہ شاہد صاحب تو مذاق کی حدیں پھاند کر فنکار بن گئے ہیں۔ تب انھوں نے استاد پکڑا، جو قریب ہی مل گئے۔ چار پیسے ڈولی پر گھر، والی بات ہو گئی۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی۔ وہ بھی پوری ہو گئی۔ خوب خوب ریاض ہوئے غرض غریب گلے کی خوب شامت آئی۔

شاہد صاحب کی آواز تو اچھی نہ تھی مگر فن سے پوری طرح آگاہ تھے۔ تال سُر کے اُستاد، جب پاکستان میں عسرت کی زندگی گزارنی پڑی تو ڈپٹی نذیر احمد کا پوتا، گویّا بن کر، پیٹ کے لیے ایندھن مہیا کرتا رہا۔ شوق روزگار بن گیا۔ پھر تو یہاں تک ہُوا کہ پاکستان کی نمایندگی بیرونِ ملک بھی جا کر کی۔ پاکستان میوزک اکیڈیمی کے صدر جو تھے۔

موسیقی کے استاد عام طور پر گا کے فن کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ مگر وہ راگ راگنیوں کو تحریر میں نہیں لا سکتے۔ چونکہ یہ پڑھے لکھے تھے۔

اس لیے بڑے ہی دل نشین انداز ہیں، انھوں نے فن کے بارے میں لکھا بھی، اگر کوئی صاحب ان کے موسیقی پر مضمون اکٹھا کرنا چاہیں گے تو وہ بڑی آسانی کے ساتھ ایک کتاب چھاپ سکیں گے۔ اس فن پر نہ ان کے باپ نے کتاب لکھی نہ دادا نے، بزرگوں پر فضیلت پائی بھی تو کس فن میں؟

موسیقی میں مبتلا ہونے یا اسے آمدنی کا ذریعہ بنانے کی مجبوری وہ حالات تھے۔ جن سے دو چار ہو کر انھیں پاکستان آنا پڑا۔ پاکستان کن حالات میں آنا پڑا۔ وہ بھی انہی کی زبانی سنیے، مرثیوں میں جس طرح مرثیہ انیس کا ہے اُسی طرح فساداتی نوحوں میں نوحہ شاہد احمد کا ہے۔ صرف چند سطریں ملاحظہ ہوں :۔

"توبہ توبہ! تھو تھو! شیطان کے کان بہرے ۔ اب سے دُور، دلی پر وہ پیغمبری وقت پڑا کہ خلقِ خدا تراہ تراہ پکار اُٹھی وہ بیرا کھیری مچی کہ مرد، عورت، بچے، بوڑھے سب کھیرے ککڑی کی طرح کاٹے جانے لگے انسانیت دم توڑ چکی تھی اور فتنہ و فساد کا شیطان ننگا ہو کر ناچ رہا تھا۔ دلی کے بازاروں میں جہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ ہُو کا عالم ہو گیا تھا۔ جہاں لچھمی بن برساتی تھی وہاں بھیروں ناچ رہا تھا۔"

شاہد صاحب ہیں، دوسروں کی خدمت کا جذبہ بڑا وافر تھا۔ وہ

ہر ملنے والے کی خدمت ہی کرنا چاہتے تھے۔ وہ سب کی بھلائی کے لیے سوچتے تھے۔ ایک دو نہیں، درجنوں ہی ملنے والوں کی زندگی سنوار دی۔ مثال کے طور پر فضل حق قریشی دلّی میونسپلٹی میں ملازم تھے۔ معمولی تنخواہ پر۔ انھوں نے قریشی صاحب میں "ادبی جراثیم" دیکھے تو انھیں وہاں سے اُچکا۔ ساقی میں جگہ دے دی۔

تھوڑے عرصے بعد، جب قریشی صاحب کا مذاقِ ادب سنور گیا تو ان کی مانگ بھی بڑھی۔ آغا اداشی نے انھیں "آج کل" کے لیے چاہا۔ تنخواہ کے بڑھا دے کی چھُوٹ دی۔

فضل حق قریشی نے سہمتے ڈرتے شاہد صاحب سے ذکر کیا، کہ "آغا صاحب مجھے لینا چاہتے ہیں۔ تنخواہ بھی زیادہ دینے کے لیے کہتے ہیں۔ آپ کا کیا حکم ہے؟"

شاہد صاحب نے کہا۔ "میں تو تمھاری ترقی چاہتا تھا۔ اس لیے میونسپلٹی چھڑوائی تھی۔ شوق سے اس پیشکش کو قبول کر لو۔ مجھے خوشی ہوگی۔"

یہ تو ایک قصّہ ہے اور نہ جانے ایسے کتنے قصّے ہوں گے۔

آوارہ حیدر آبادی، تابش دہلوی، انصار ناصری، اخلاق احمد دہلوی، خمار دہلوی، شمس زبیری یہ سب کے سب اُنھی کے لگائے ہوئے پودے ہیں۔ انھیں شاہد صاحب پہ ناز تھا۔ شاہد صاحب کو ان پہ ناز تھا۔ اس

ضمن میں البتہ یہ ہے کہ اپنے بچوں کے لیے کچھ نہ کیا۔ دس بچے، جن میں تین لڑکے اور سات لڑکیاں، یہ سب کے سب اُس چیز کی بھینٹ چڑھ گئے جسے اگلے وقتوں کے لوگ خود داری کہتے تھے اور آج کل کے لوگ بے وقوفی!

شاہد صاحب وضع دار اتنے تھے کہ زندگی میں جو معمول بنا لیا۔ بس بنا لیا۔ اُس کی ایک مثال یہ بھی ہے:

شاہد صاحب روزانہ چار پانچ بجے کے درمیان، کتب خانہ علم و ادب (دہلی) میں پہنچ کر، رات کے سات آٹھ بجے تک رہا کرتے تھے۔ آندھی آئے یا طوفان، شاہد صاحب پہنچتے ضرور تھے۔ حتّٰی کہ عید بقرعید کا بھی ناغہ نہ ہُوا۔

کتب خانہ میں اور لوگ بھی آیا کرتے تھے۔ چار بجے سے پہلے کتب خانہ کتب خانہ ہوتا تھا۔ چار بجے کے بعد "ادبی اڈّا" بن جاتا تھا۔ باقاعدہ پہنچنے والوں میں انصار ناصری، فضل حق قریشی، ظفر قریشی، اخلاق احمد دہلوی، صادق الخیری اور نہال سیوہاروی تھے۔

باہر سے کوئی ادیب آتا تھا تو وہ بھی شام کے وقت کتب خانہ علم و ادب میں پہنچ جایا کرتا تھا۔ کیونکہ اُسے معلوم تھا۔ وہاں ایک ساتھ بہت سے ادیبوں سے ملاقات ہو جائے گی۔ یوں اُس دکان پر شاہد صاحب

کی وجہ سے، ہندوستان بھر کے ادیب اور شاعر اکٹھے ہوتے رہے۔ اپنی کہتے اور دوسروں کی سنتے رہے۔ دلچسپ صحبتیں تھیں وہ! ایک بار میں نے شاہد صاحب سے، اُنہی صحبتوں کا ذکر کیا تھا تو انھوں نے مختصراً اتنا کہا تھا ؎

کلکتے کا جو ذکر کیا تُو نے، ہمنشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

شاہد صاحب شاعروں سے بہت بھاگتے تھے۔ مگر یہ لوگ اُس دن کی طرح آج بھی خوش مذاق لوگوں کا پیچھا کرتے ہیں۔ اپنا کہا سناتے ہیں۔ کوئی خوش دلی سے سُن لے تو، بے دلی سے سُنے تو، سناتے ضرور ہیں۔ اس صورتِ حال سے بچنے کے لیے، شاہد صاحب نے ایک اصول نافذ کر رکھا تھا۔

اگر کوئی شاعر، اپنے شعر سنانا چاہتا ہے تو وہ بے شک سنائے، مگر شرط یہ ہے کہ سامعین کو ایک ایک، چائے کا کپ پلائے اور اگر کوئی شاعر اپنے شعر ترنم سے سنانا چاہتا ہے تو وہ چائے کے ساتھ کچھ کھلائے بھی، یہی وجہ تھی کہ کتب خانہ علم و ادب میں کوئی شخص، جرمانہ ادا کیے بغیر شعر نہیں سنا سکتا تھا۔

کبھی کبھی کوئی شاعر، چالاکی سے سادہ چائے منگوا کر، تحت اللفظ پڑھنا شروع کر دیتا تو شاہد صاحب کہتے۔ "اماں یار! تحت اللفظ کیوں

پڑھ رہے ہو۔ ہمیں تو بھوک لگی ہے۔ پڑھنا ہے تو ترنّم سے پڑھو۔ ورنہ ہماری اشتہا میں اضافہ نہ کرو۔"

شاہد صاحب کے یوں تو کئی ادیبوں اور شاعروں سے مراسم تھے مگر دو کے ساتھ بڑی خصوصیت تھی۔ ایک مولوی عنایت اللہ دہلوی سے، دوسرے عظیم بیگ چغتائی سے!

مولوی عنایت اللہ شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ کے بیٹے تھے۔ مترجم اس بلا کے تھے کہ ہزاروں صفحات ترجمہ کر ڈالے۔ فاضل اتنے تھے کہ چاہتے تو متعدد طبعزاد کتابیں لکھ ڈالتے، مگر انھوں نے کیے تو صرف ترجمے ہی کیے۔ وہ بھی زیادہ تر شاہد صاحب کے لیے!

عظیم بیگ چغتائی کو بھی شاہد صاحب سے بڑی محبت تھی۔ شاہد صاحب بھی ضرورت کے وقت مالی امداد سے ہاتھ نہ کھینچتے تھے۔ ایک مرتبہ عظیم بیگ بیمار ہوئے۔ شاہد صاحب کو اپنی دل بستگی کے لیے بلایا۔ ان کے پہنچتے ہی وہ اپنی بیماری بھول گئے اور شاہد صاحب کی خوشنودی کے لیے افسانے لکھوانے شروع کر دیے۔ (کیونکہ کمزوری کی وجہ سے خود لکھنے سے معذور رہتے) جس دن شاہد صاحب واپس چلنے کے لیے کہتے وہ انھیں ایک اور مضمون لکھوا دینے کا لالچ دے دیتے۔ یوں ان کی محبت اور اُن کے "لالچ" کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک پورے چغتائی نمبر کا مواد اکٹھا

ہو گیا۔ چنانچہ چھپا ساقی کا "چغتائی نمبر"!

شاہد صاحب جوش صاحب کے خلاف ایک نمبر نکالنا چاہتے تھے۔ میں انھیں منع کرتا تھا۔ مگر وہ مان نہیں رہے تھے۔ اس سلسلے میں میری ان سے خاصی لمبی چوڑی خط و کتابت ہوئی تھی۔ شاہد صاحب مجھ سے بھی جوش صاحب کے بارے میں مضمون چاہتے تھے۔ میں ان سے کہتا تھا۔ میرے مضمون لکھنے کا کیا سوال! آپ بھی جو کچھ کر رہے ہیں۔ زیادتی کر رہے ہیں۔ کچا دودھ کس نے نہیں پیا؟ لہٰذا اس مسئلے پہ "مٹی ڈالیے"، مگر شاہد صاحب اس مسئلے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتے تھے۔

جب شاہد صاحب کا مضمون کے سلسلے میں اصرار بڑھا تو میں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے ان سے کہا۔ "اگر آپ پسند کریں تو یہ سلسلہ جوش، میری اور اپنی خط و کتابت شائع کر دیں۔ انھوں نے حامی بھر لی۔ میں حیران ہوا۔ حیران اس لیے ہوا تھا کہ اُس خط و کتابت میں شاہد صاحب کا پہلو دبتا تھا۔ پھر میں نے سوچا، شاہد صاحب وہ فقرے اور وہ باتیں حذف کر دیں گے۔ جن میں اُن پر حرف آتا ہو گا۔

جب وہ نمبر چھپ گیا۔ جس میں وہ خط و کتابت بھی تھی تو میں اور حیران ہوا۔ وہ یوں کہ شاہد صاحب نے اُس میں سے کوئی فقرہ کاٹا نہ تھا۔ ساری خط و کتابت جوں کی توں چھاپی تھی۔ صاحب! یہ حوصلے اور کردار کی بات

ہے جو ہر ایک کے نصیب میں نہیں۔

انتقال سے کچھ دن پہلے، انھوں نے مجھے اپنا مضمون مولانا عبدالسلام نیازی پر بھجوایا تھا۔ توقع نہ تھی کہ وہ میری درخواست پر، اپنی طویل علالت کی ابجھیڑ کی وجہ سے، کچھ لکھ بھی سکیں گے مگر انھوں نے لکھا۔ میں حیران! اس سے یہ اندازہ ہوا تھا کہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں۔ مضمون پڑھا تو وہ بھی قلم گھسیٹ قسم کا نہ تھا۔ اچھا خاصا تھا۔ جواب میں میں نے لکھا تھا کہ ایک بار میں بھی مولانا نیازی کی خدمت میں حاضر ہُوا تھا اور میری اُن سے یہ گفتگو ہُوئی تھی:

"فارسی جانتے ہو؟"

"جی نہیں!"

"عربی؟"

"جی نہیں!"

"علم منطق اور معقولات و منقولات؟"

"جی نہیں۔"

"پھر یہ کیوں نہیں کہتے کہ اُمّی ہوں۔"

میرے اس خط کے تین چار روز بعد، شاہد صاحب کا جواب آیا۔ مولانا نیازی کے علم و فضل کا یہی عالم تھا کہ پڑھے لکھے سے پڑھا لکھا آدمی

بھی، مولانا کے سامنے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مَیں بھی کچھ پڑھا ہوا ہوں۔ مولانا ابو الکلام آزاد ایسے آدمی بھی ان کے سامنے زبان کھولتے ہوئے ڈرتے تھے۔ مَیں آپ کا بڑا ممنون ہوں گا۔ اگر آپ میرے مضمون میں اپنے یہ فقرے ایزاد کر دیں۔ خواہ اپنے نام سے، خواہ میرے نام سے کیونکہ مولانا کی شخصیت کے سلسلے میں ان فقروں کا اضافہ ضروری ہے۔

چنانچہ میں نے اپنا نام بتائے بغیر، ان کے حکم کی تعمیل کر دی تھی اپنا نام اس لیے ظاہر نہیں کیا تھا کہ مجھے اپنی سُبکی کا احساس ہوتا تھا مگر آج اپنا نام ظاہر کر دیا۔ اس لیے کہ یہ حوصلہ بھی مجھے شاہد صاحب نے دلایا ہے۔

ابھی تک اس ملک میں رائٹرز گلڈ کا وجود ہے۔ عرض کر چکا ہوں کہ اس کے بانیوں میں شاہد صاحب کا بھی نام آتا ہے۔

یاروں نے بہکایا کہ مجھے بھی رائٹرز گلڈ کا ممبر بننا چاہیے۔ ہر چند کہ مَیں، اپنی طبیعت کی افتاد اور اس کی "قدرے غیر ضروری سی قناعت" کے باعث، اس امر کی ضرورت نہ سمجھتا تھا مگر ضرورتاً مجھے "ادیب بننا پڑا"۔ وجہ یہ تھی کہ رائٹرز گلڈ کے پلیٹ فارم سے، اس نیاز مند کے خلاف ہلبلی شروع تھی۔ نیا قصہ انتخابی پرچوں کے خلاف مہم کا تھا۔

ممبر شپ کے لیے میرا نام، مغربی پاکستان کی مجلسِ عاملہ نے منظور

کرکے کراچی، یعنی مرکز کو بھجوا دیا تھا۔ خدشہ تھا کہ مرکز اسے منظور نہ کرے گا۔ وجوہ ظاہر تھیں۔ پنجاب اور کراچی کا بُعد، انتخابی پرچوں سے پرخاش، شاہد صاحب سے تناتنی!

چنانچہ جب میرا نام ممبرشپ کے لیے سامنے آیا تو ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔

ادیبانہ شور! ـــ "ممبر بنایا جائے" "ممبر نہیں بنایا جائے گا"

دیکھتے ہی دیکھتے تقریریں شروع ہوگئیں۔ کوئی حق میں، کوئی خلاف جنھوں نے میرے خلاف ہنگامہ کیا۔ ان کے نام بھول چکا ہوں۔ جنھوں نے میرے حق میں کلمۂ خیر کہا۔ اُن میں سیّد وقار عظیم، قرۃ العین حیدر، قدرت اللہ شہاب اور شاہد احمد دہلوی تھے۔

شاہد احمد دہلوی؟

جی ہاں! شاہد احمد دہلوی! وہی شاہد احمد دہلوی، جو کچھ عرصہ پہلے میرے خلاف لکھ رہے تھے۔ بپھرے ہوئے قلم سے!

اب میں ایسے "دشمن" کو کہاں سے ڈھونڈھ کے لاؤں؟

ادبی رسائل کی حالت، ہمیشہ سے خراب رہی ہے۔ بڑے بڑے معرکے کے پرچے نکلے۔ جن میں زمانہ، مخزن، ادیب، ہمایوں، نیرنگ خیال، ادبی دنیا اور ساقی! مگر یہ رہے مالی اعتبار سے زیربانہ

ہی، جس کے پاس جتنا سرمایہ ہوتا ہے، وہ اتنا پھونک کے بیٹھ جاتا ہے۔ نہ عوام اتنا ساتھ دیتے ہیں کہ کوئی رسالہ اپنا خرچ چلا سکے اور نہ حکومت ہی اس "غلط کام" میں ہاتھ ڈالنا چاہتی ہے۔ حکومت فیملی پلاننگ پر کروڑوں روپے خرچ کر سکتی ہے مگر ادبی رسائل کے سلسلے میں، اس کے پاس کسی قسم کی پلاننگ نہیں۔

میں بڑا حیران ہوتا ہوں کہ یہ ادبی رسالوں کے مدیر پاگل ہوتے ہیں یا کیا کہ وہ جانتے بوجھتے گھاٹے کا سودا کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی جدّو جہد، اپنی کاوشیں، اپنا روپیہ اور اپنا خونِ جگر یوں اُچھال دیتے ہیں کہ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو اور ہمارا یہ کرتب عوام بھی دیکھتے ہیں۔ خواص بھی اور حکومت بھی مگر کسی کو ہمدردی پیدا نہیں ہوتی۔

ادبی رسائل کی حالتِ زار پر شاہد صاحب بہت کُڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے کراچی میں بیٹھ کر ایک اسکیم بنائی کہ ایک آل پاکستان ادبی رسائل کی انجمن بنائی جائے تاکہ رسائل کی حالت کو کسی طرح استوار کیا جائے۔ جلسے ہوئے۔ ریزولیوشن پاس ہوئے۔ بھاگ دوڑ کی۔ حکومت کی چوکھٹ پر ناک بھی رگڑی، مگر معاملہ وہی ڈھاک کے تین پات، آج تک حکومت نے ادبی رسائل کے لیے کچھ نہیں کیا۔ حالانکہ ہم لوگ وزیرِ تعلیم سے بھی ملے تھے۔ وزیرِ خزانہ سے بھی، اور اُن لوگوں سے بھی، جو غلط کار

سے مگر حکومت کے دربار میں اہمیت رکھتے تھے اگر وہ لوگ کچھ کر گزرتے تو ممکن تھا کہ شاہد صاحب اتنی کس مپرسی کی حالت میں نہ مرتے کیونکہ یہ ہندوستان کے لکھ پتی تھے مگر پاکستان کے "کنگال پتی !"

انجمن کو فعال بنانے کے لیے، شاہد صاحب نے اتنی جد و جہد کی، جس کی کوئی حد نہیں۔ آٹھ پہر چونسٹھ گھڑی اسی کی فکر، اس سلسلے میں شاہد صاحب نے مجھے بھی گھیرا۔ میں کتنی کتراتا رہا۔ اس لیے کہ مجھے معلوم تھا کہ کچھ نہ ہوگا۔ اچھے کاموں کی توفیق کسے ہے ؟ مگر شاہد صاحب کے خلوص اور اصرار کے سامنے میں نے بھی ہتھیار ڈال دیے تھے۔ کئی سال تک ہم لوگ لکھتے لکھاتے رہے۔ بھاگتے دوڑتے رہے مگر وہی ہوا جس کا مجھے پہلے دن سے خدشہ تھا۔

ایک واقعہ سنیے !

مجھے شاہد صاحب نے لکھا۔ "مولانا صلاح الدین احمد کی خدمت میں حاضری دو اور انھیں انجمن کا ممبر بناؤ۔ چنانچہ پہنچا۔

"مولانا ! السلام علیکم !"

"آئیے آئیے !"

"کراچی میں فلاں فلاں دوستوں نے مل کر، ایک انجمن، انجمن ادبی رسائل کے نام سے بنائی ہے۔ سب دوستوں کی خواہش ہے کہ آپ بھی

اس کے ممبر بنیں تاکہ انجمن زیادہ باوقار اور زیادہ مؤثر بن سکے۔"

"انجمن کا دائرہ کار کیا ہوگا؟"

"انجمن اس امر کی کوشش کرے گی کہ آج کل نیوز پرنٹ کی جو نایابی ہے اس کا تدارک کیا جائے۔ ادبی رسائل کو بھی اشتہارات ملیں اور ——"

"رُکیے! —— میں سمجھ گیا۔ میں آپ کی انجمن کا ممبر نہیں بن سکتا۔"

"کیوں؟"

"اگر مجھے نیوز پرنٹ ملنے لگا۔ اشتہارات ملنے لگے تو مجھے مجبوراً پرچہ نکالنا پڑے گا اور مجھے پھر گھاٹا ہوگا۔ میں تو آپ کی انجمن کی مخالفت کروں گا تاکہ نہ ہمیں نیوز پرنٹ ملے نہ ہمیں اشتہارات ملیں اور نہ ہم تباہ ہوں۔"

مولانا کی اس گفتگو میں، بیکسی کی جو لہر ہے۔ وہ ادبی رسائل کا مقدر ہے۔

شاہد صاحب خدمتِ خلق کے سلسلے میں، ہر لمحہ مستعد رہتے تھے۔ وقت ضائع کرتے تھے۔ روپیہ تھا نہیں ورنہ وہ بھی لٹاتے، انجمن ادبی رسائل کیلیے انھوں نے بڑا کام کیا، مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ رائٹرز گلڈ کے بھی مخلص خدمت گزاروں میں سے تھے مگر سنا ہے کہ جب شاہد صاحب کا انتقال ہوا تو رائٹرز گلڈ کے ممبران میں سے کوئی بھی جنازے میں شریک نہ تھا۔ یہ حشر ہوا شاہد صاحب

کی اُن کارگزاریوں کا، جس میں تنہا ان کی ذات کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اگر حکومت بے مہر ہے تو قوم احسان فراموش، حکومت فیملی پلاننگ میں لگی ہُوئی ہے اور قوم ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹنے میں، نہ فرصت اسے ہے نہ اُسے!

اچھا آدمی کتنا اچھا ہے اور بُرا آدمی کتنا بُرا، اس کا حال کچھ سفر میں زیادہ ہی کُھلتا ہے۔ مجھے یہ سعادت بھی نصیب ہُوئی کہ ہم نے اکھٹے مشرقی پاکستان کا دورہ کیا۔ ہم پانچ افراد تھے۔ شاہد احمد دہلوی، مولانا رازق الخیری، حکیم یوسف حسن، عشرت رحمانی اور یہ خاکسار!

مولانا رازق الخیری سارے سفر میں ہمیں یہی بتاتے رہے کہ میں بڑے کام کا آدمی ہوں۔ میری قدر کرو۔ حکیم یوسف حسن اپنی زندگی کے ایسے واقعات سے دل بہلاتے رہے کہ ہم میں سے بعضوں کو عمرِ رفتہ کو آواز دینے کی ضرورت پڑ گئی۔ عشرت رحمانی صاحب یہ سمجھاتے رہے کہ

——— تم سب بچے ہو۔ اِس ٹولی کا دماغ مَیں ہُوں۔

ہم میں سے ایک شاہد صاحب ایسے تھے جو اپنی کسی حیثیت پہ نازاں نہ تھے۔ جب یہ سارے ساتھی ڈون کی لیتے تو شاہد صاحب ہلکا سا قہقہہ لگاتے۔ پھر قہقہہ لگاتے۔ پھر قہقہہ لگاتے۔

انسان کا سفر ازل سے جاری ہے۔ ابد تک جاری رہے گا۔

دنیا میں آکر ہر شخص اپنا اپنا کردار ادا کر کے نیک نامیوں اور حسرتوں کی گود میں سو جاتا ہے۔ اُن میں سے ایک شاہد صاحب بھی تھے۔ یہ اس اعتبار سے خوش قسمت ہیں کہ ہم زیادہ تر ان کی اچھائیوں سے واقف ہیں۔



حکیم صاحب

میں بیک وقت دو شخصیتوں سے متصادم ہونے والا ہوں۔ ایک حکیم یوسف حسن سے، دوسرے نیرنگِ خیال سے، دلکشی دونوں میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں۔ نیرنگِ خیال بھی شخصیت ٹھہری؟ میں عرض کروں گا۔ کیوں نہیں؟ جس نے ذہنوں کو نکھارا ہو۔ شخصیتوں کو جلا بخشی ہو۔ وہ شخصیت ہی نہیں۔ اس سے بھی بڑی کوئی بلا ہے۔

یہ خدا کی دین ہے۔ کسے معلوم تھا کہ ریلوے کا گڈز کلرک یوسف حسن، کبھی نیرنگِ خیال ایسے عظیم رسالے کا خالق ہوگا۔ جو ایک

کارِ بلند انجام دے گا اور صاحبِ روایت شخصیت بنے گا۔ ورنہ ادبی پرچوں کی کہانی تو صرف اتنی ہوتی ہے۔ زن سے نکلے، چمن سے غائب!

مضمون شروع کرنے سے پہلے اگر مَیں یہاں یہ اقرار کرلوں تو مناسب ہوگا کہ ان میں سے 'ایک شخصیت کی تصویر کشی میں' مَیں آپ سے کوئی رعایت نہیں چاہتا۔ مگر دوسری "شخصیت" کے سلسلے میں، کچھ چھوٹ کا بھی ملتجی ہوں۔ وہ بھی اس لیے کہ حق کی ترازو میں' مجھے مضمون نویسی سے زیادہ نیرنگِ خیال کا دھیان رہنا چاہیے۔ اگر یہ نہیں تو میرا رشتۂ گفتگو بیکار!

مَیں لاہور کا رہنے والا، حکیم صاحب بھی لاہور کے باسی، مگر ہماری ملاقات ہوئی لکھنؤ میں' شوکت تھانوی کے ہاں! غالباً ۱۹۴۵ء میں' معاملہ علیک سلیک تک ہی رہا۔ اُس وقت حکیم صاحب بہت کچھ تھے۔ اس لیے منہ کیوں لگاتے مَیں کچھ نہ ہونے پر بھی سُبک ہو کر کیوں ملتا؟

بہرحال ان کا انداز کچھ خوں خوں قسم کا ہی تھا۔ سوٹ میں ملبوس تھے۔ سر پر ہیٹ تھا۔ مَیں نے سُنا ہے کہ اُن دنوں چھوٹے موٹے ادیب ان سے ملتے ہوئے جھجکتے ہی تھے۔ آج بھی ایک بڑے ادیب یہ کہتے ہیں کہ اُن دنوں میری ہمت نہ تھی کہ ان سے بلا جھجک گفتگو کرسکتا۔ ایک تو نام کا رعب تھا۔ دوسرے شخصیت کا!

تصدیق کے طور پر' اُردو کے مشہور مزاح نگار مرزا فرحت اللہ بیگ

کی بھی رائے سُن لیں۔ ابھی انھوں نے حکیم صاحب کی صرف تصویر دیکھی تھی۔

• پرچہ کے اوپر کا کاغذ پھاڑا۔ شروع ہی میں ایک زبردست آدمی کی تصویر نظر آئی۔ خیال ہُوا کہ امان اللہ خاں کا فوٹو ہوگا۔ ایک دفعہ ہی کونہ پر نظر پڑی اور خونی حرفوں میں لفظ "ایڈیٹر" دکھائی دیا۔ یقین مانیے کہ اچھل پڑا۔ بھلا یہ اور آپ! اللہ رحم کرے۔ جو نقشہ اب تک آپ کی شکل کا دل میں بیٹھا تھا۔ وہ یک قلم محو ہو گیا۔ سمجھتا تھا کہ حکیم ہیں دُبلے پتلے آدمی ہوں گے۔ لمبی داڑھی ہو گی۔ چندھیائی ہوئی آنکھیں ہوں گی۔ اُوپر موٹے تالوں کی آٹھ آنہ والی عینک ہو گی۔ جسم پر کشمیری کام کا چوغہ ہو گا۔ اُس کی گھنڈی ثابت اور تکملہ ٹوٹا ہُوا ہو گا۔ غرض عین مین حکیم جی ہوں گے مگر حضرت آپ نے تو غضب کر دیا۔ خدا کے لیے یا تو اپنے نام کے سامنے سے "حکیم" کا لفظ نکالیے یا حکیموں کی سی شکل بنائیے۔ ورنہ اور نہ سہی، مَیں تو یہی سمجھوں گا کہ حکمت کی سند آپ نے کہیں سے اُڑائی ہے۔ یا نقل کر کے امتحان میں پاس ہُوئے ہیں۔ آپ کے خطوں میں حرفوں پر باقاعدہ نقطے ہوتے ہیں۔ اُس نے شبہ میں ڈال دیا کہ بس یونہی

سے کچھ حکیم ہیں۔ لیکن آپ کی تصویر نے اور رہے سہے خیالات، آپ کی طرف سے خراب کر دیے۔ یقین مانیے کہ آج سے مَیں آپ کے نام کے ساتھ "حکیم" کا لفظ کبھی نہیں لکھوں گا۔ ایسے فیشن ایبل آدمی کے لیے "حکیم" کا لفظ استعمال کرنا ایک طرف اس لفظ کی توہین ہے تو دوسری طرف خود اس شخص پر پھبتیاں اڑانا ہے۔ اس لباس اور اس شکل میں آپ کو ایڈیٹر بننے کا یقیناً حق حاصل ہے لیکن حکیم بننے یا حکیم کہلانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میرا ارادہ مونچھیں بھی منڈوا دینے کا ہے۔ ضرور بسم اللہ کیجیے۔ مگر اپنی اس نئی صورت کا فوٹو ضرور شائع کیجیے۔ اور نیچے میرا یہ شعر لکھ دیجیے:۔

داڑھی تو منڈاتے تھے مونچھیں بھی صفا کر دیں
اب نکلی ہے اے فرحتؔ کچھ صورت مردانہ "

میں نے اپنی رائے کی تصدیق میں، مرزا فرحت اللہ بیگ کی رائے پیش کی۔ اب مرزا فرحت اللہ بیگ کی رائے کی تصدیق کے لیے خواجہ حسن نظامی کی رائے پیش کرتا ہوں۔ تاکہ کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہ رہے۔

"مَیں بُت شکن قوم کا بیٹا۔ تُو کاغذی بُت سنے زمانہ کا!
دیکھوں تو موجود، ہاتھ لگاؤں تو نابود! تُو ہے یا نہیں ہے؟

آنکھ جانتی ہے تو ہے۔ ہاتھ کہتا ہے نہیں ہے۔

اگر ہو تو انگریز ہو۔ کیونکہ رخ انگلش دل ترکانہ داری!

پیشانی ایسی جیسے مومن کا دل، صاف، بلند، کشادہ، بھویں

بھیلوں کے تیر کی کمان، آنکھیں قاف کی پریوں سے چرائی ہوئی۔

ناک، رخسار، مونچھیں ایسی، جیسے جرمن فوج کا بندوقچی، ٹھوڑی میں

کنواں نہیں ہے جس کو غب غب کہتے ہیں۔ البتہ مصورِ قدرت

نے تصویر بناتے وقت چاہِ یوسف کا سایہ دکھایا ہے۔ اوپر

ظلمت، نیچے نور، گویا رات دن کا فرق ایک جگہ جتایا ہے۔

اس بت کے کان ایک ہی ہے۔ یہ بولتا نہیں چپ

ہے تو سنتا بھی نہ ہوگا اور سنتا ہوگا تو فقط ایک کان سے

کیونکہ دوسرا کان کئی لاکھ کوس سے فقط اپنا ماتھا دکھا

رہا ہے۔

کپڑے اس کے بدیشی، بائیکاٹ کا ہدف، سینہ

پر بے رنگ پھول نہیں نیرنگ" کی ایک بے رنگی!"

(نیرنگِ خیال دسمبر ۱۹۳۱ء)

مرزا فرحت اللہ بیگ اور خواجہ حسن نظامی بڑے شخصیت نگار

ہیں۔ لہٰذا اس باب میں، ان کا کچھ کہنا، سند پہ سند والی بات ہے ۔۔

غرض شبنبد کے مطابق یہ قیامت ہی قیامت تھے۔

۱۹۴۵ء میں جب مَیں نے انھیں دیکھا تو کچھ ایسے تھے :

رنگ شنگرفی، چہرے پہ چمک، آنکھوں میں بجلیاں، قامت بلند، جسم گٹھا ہُوا، مونچھیں گھنی، ناک نقشہ موہنا، خوش وضع، خوش قطع، چال پُرشکوہ اور چہرہ باوقار!

آواز میں طنطنہ، باتوں میں تیقّن ــــ ایک جلالی شخصیت!

آج جب یہ مضمون لکھ رہا ہوں تو :

(بہت آہستہ آہستہ پڑھیے) رنگ سفید، چہرے پہ رونق، آنکھوں میں جان، کمر نیم خمیدہ، جسم ڈھلتا ہُوا، مونچھیں سفید، داڑھی سفید، ناک پہ عینک، دانت غائب، حلیم الطبع، سلیم الفطرت، چال میں لڑکھڑاہٹ اور چہرہ سوالیہ!

آواز میں کچھ ٹھسک، باتوں میں کچھ امید، ــــ مگر ایک مشفق شخصیت

غرض حکیم صاحب کی شخصیت میں بڑی موہنی ہے۔ اس کے ساتھ ہنگامہ خیزی بھی، کچھ ایسی ہی باتوں کو ذہن میں رکھ کر مَیں نے حکیم صاحب کی خدمت میں گزارش کی۔ اپنی سوانح لکھ ڈالیے۔ میری سوچ پر، علامہ اقبال کا یہ شعر سوار تھا ؎

تو اپنی سرگزشت خود اپنے قلم سے لکھ　　خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

مگر جواب ملا تو یہ، ''میری سوانح میں کیا رکھا ہے؟''

''آپ کی سوانح میں کیا نہیں رکھا۔ جو کچھ آپ کے پاس ہے۔ ویسا کچھ تو ادبی میدان میں کسی کی بھی گرہ میں نہیں۔''

''اس بڑھاپے میں مجھے غلط رستے پر نہ ڈالو یار!''

میں نے محسوس کیا کہ حکیم صاحب اس فرض سے سبکدوش نہ ہوں گے۔ کچھ اپنی عمر کے تقاضے سے، کچھ اپنی انکساری کی وجہ سے، یہی وجہ تھی کہ میں نے اُن کی باتیں چرانی شروع کر دیں۔ یہ سوچ کر کہ اگر اس "جن" کو میں نے بھی سرِ صفحات قید نہ کیا تو پھر بات رہ جائے گی۔ عامل میں نہیں ہوں۔ انجام خدا معلوم، دھڑکتے دل کے ساتھ آنکھیں چار کرتا ہوں۔

حکیم صاحب کو اپنی تعلیم کے ادھورے رہ جانے کا بڑا افسوس ہے۔ کہتے ہیں کہ میں ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ بے حد ذہین تھا۔ بے حد لائق، یہی وجہ تھی کہ میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو درخواست دی کہ میں ساتویں اور آٹھویں جماعت کا امتحان اکٹھا دوں گا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب اور میرے استاد کے درمیان، میرے متعلق کچھ باتیں ہوئیں۔ نتیجہ یہ نکلا درخواست منظور ہو گئی۔ یہی ڈھیل میرے لیے تعلیمی تباہی

۱؎ سن ولادت ۳ جون ۱۸۹۲ء

لائی۔ مَیں نے اپنا وطیرہ یہ بنا لیا تھا کہ استاد کو، اسکول سے یہ کہہ کر چلا جاتا تھا کہ آٹھویں جماعت کی تیاری کرنی ہے۔ لہٰذا ساتویں جماعت میں بیٹھ کر کیا کروں؟ اسکول سے نکلتا، سیدھا پنجاب پبلک لائبریری پہنچ جاتا۔ وہاں جا کر پڑھتا، کیا؟ طلسمِ ہوشربا! نو مہینے تک طلسمِ ہوشربا پڑھتا رہا۔ صبح جاتا تھا۔ لائبریری بند ہونے تک پڑھتا رہتا تھا۔

اُس کتاب نے مجھے ایسا پکڑا تھا کہ ہل نہ سکا۔ اُس ماحول میں پڑھائی خاک ہوتی۔ شام ہوتی تھی تو صبح کا انتظار، نتیجہ! آنکھیں نکل آئیں۔ چہرہ زرد ہو گیا۔ صورت وحشت زدہ، مگر شوق تھا کہ فزوں سے فزوں تر! پھر عمر ایسی کچی تھی کہ کتاب کے ہر ہر واقعے سے متاثر ہوتا تھا۔ مثلاً نور افشاں جادوگر کو مسلمانوں کا خیر خواہ بتایا ہُوا تھا۔ وہ ایک جگہ مر جاتا ہے۔ میرا یہ پڑھنا تھا کہ بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ اتنا رویا، اتنا رویا کہ گھگی بندھ گئی۔ جیسے میرا کوئی بھائی بند مر گیا ہو۔

ان حالات میں جب آٹھویں جماعت کا امتحان قریب آگیا تو مجبوراً پڑھائی پر توجہ دی۔ کورس کی کتابیں کچھ کہتی تھیں۔ طلسمِ ہوشربا کے کردار کچھ، غرض ذہن خوب اُتھل پُتھل ہُوا۔ کہنے کو تو مَیں پاس ہو گیا مگر جو میرے ذہن کی چمک تھی۔ وہ ماند پڑ گئی۔ نویں جماعت میں مَیں نے یہ محسوس کیا کہ باقی لڑکوں سے کمزور ہوں۔ یہ چیٹک ایسی تھی کہ پھر کورس کی کتابوں میں دل نہ لگا۔ نویں جماعت بمشکل پاس کی۔ دسویں جماعت

پاس کرنے کی بجائے، میں نے مناسب یہ سمجھا کہ طلسم ہوش رُبا پر ہی پی ایچ ڈی کر دوں۔ یوں کورس کی کتابیں ہاتھ سے چھوٹ ہی گئیں۔

حکیم صاحب یہ واقعہ بیان کر چکے تو میں نے کہا۔ "اس کتاب نے آپ کو بڑا نقصان پہنچایا۔"

"میں تو پھر بھی بچ گیا۔ اس کتاب نے ہزارہا آدمیوں کو اندھا کر دیا اور ہزاروں ہی کی زندگی تباہ کر ڈالی۔"

حکیم صاحب کے پڑھنے کا حال سُن لیا ــــ اب کچھ لکھنے کا بھی سُن لیجیے:-

یہ بھی ایک عجیب اور دلچسپ قصّہ ہے۔ جس نے میری ادبی زندگی کی طرف باگیں موڑ دیں۔ میں "انتخاب لاجواب" پڑھا کرتا تھا۔ مجھے اس کے ایڈیٹوریل پسند تھے۔ اس لیے میں نے ایک افسانہ نما مضمون "پُر اسرار عمارت" لکھ کر مدیر "انتخاب لاجواب" کو بھیجا، جس وقت میں نے وہ مضمون بھیجا تھا اس وقت میری عمر چودہ برس تھی۔

مجھے امید نہ تھی کہ میرا مضمون چھپے گا۔ نہ صرف مضمون چھپا بلکہ منشی محبوب عالم ایڈیٹر انتخاب لاجواب کی طرف سے ایک خط بھی ملا۔ رقم تھا۔ مجھ سے آکر ملیے۔"

اُچھلتا کودتا دفتر پہنچا، چٹ بھجوائی۔ فوراً بلا لیا گیا۔ مگر وہ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ پوچھا "یہ مضمون جو ہمارے رسالے میں چھپا ہے۔ آپ کا

لکھا ہوا ہے؟"

"جی ہاں!"

"کیا کرتے ہیں آپ؟"

"آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہوں۔"

"اچھا تو آپ ابھی، اپنی تعلیم جاری رکھیں۔ مجھے تو اسسٹنٹ ایڈیٹر کی ضرورت تھی۔"

مَیں نے دیکھا کہ اُن کی میز پر پیپر ویٹ پڑا ہے۔ جس پر لکھا ہے TIME IS MONEY اس لیے مَیں نے اس کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

"مجھے اجازت دیجیے۔"

اس پر منشی محبوب عالم مسکرائے، کھڑے ہو کر ہاتھ ملایا۔ مَیں بڑا خوش ہُوا کہ اتنے سے بچے کی اتنی حوصلہ افزائی! اگرچہ اسسٹنٹ ایڈیٹر کی میری تحریر کا یہ مقام و مرتبہ، کج طبع تھا۔ کج ذہن تھا۔ مہینوں زمین پر پاؤں نہ ٹکے۔"

اُن دنوں انتخاب لاجواب کا بڑا مقام تھا۔ اس ادارہ سے "انتخاب لاجواب" کے علاوہ بھی پرچے نکلتے تھے۔ جو بڑے پائے کے تھے، جن میں روزانہ پیسہ اخبار ہفت روزہ پیسہ اخبار، ماہنامہ شریف بیوی اور بچوں کا اخبار!

اُنہی دنوں پیسہ اخبار کے علاوہ دو اور اخبار بھی لاہور سے نکلتے تھے جن میں

"وطن" اور "اخبارِ عام" زیادہ مشہور تھے۔ "وطن" اور "پیسہ اخبار" میں خوب چپقلشیں رہتی تھیں۔ ایک دوسرے کے خلاف خوب لکھا جاتا تھا۔ صبح جوتیوں میں دال بٹتی نظر آتی۔ مگر شام کو منشی محبوب عالم اور انشاء اللہ خاں ایک ہی لینڈو میں بیٹھے، سیر کو جاتے ہوئے نظر آتے۔ عجیب لوگ تھے۔ عجیب کردار تھا ان کا!

"اخبارِ عام" کچھ اس انداز سے نکلتا تھا کہ اخبار میں "اخبار کی بہار" کے عنوان سے ایک سطر میں پورے اخبار کی چوڑائی کے برابر، ایک خبر ہوتی تھی۔ جس میں یہ لکھا ہوتا کہ فلاں جگہ اور فلاں فلاں آدمیوں کے درمیان لڑائی ہوئی اور اُن میں سے فلاں شخص مارا گیا۔ پھر اُسی سطر میں، آخر میں ایڈیٹر کی طرف سے یوں تبصرہ ہوتا! — "خدا کی مرضی!"

یا یہ خبر کہ فلاں عورت کے فلاں مرد کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے۔ موقع پاکر دونوں بھاگ گئے۔ ایڈیٹر کی طرف سے تبصرہ! — بدمعاشی کی انتہا۔

یا یہ خبر کہ فلاں دفتر میں، فلاں مجسٹریٹ نے اس وقت چھاپا مارا۔ جب کہ کلرک رشوت لے رہا تھا۔ تبصرہ! — پیٹ کی مار!

دیکھی آپ نے لہجے کی ٹکور، آج بھی کوئی اخبارِ عام کے فائل کھنگالے گا تو اُسے خبروں کے ساتھ، ایڈیٹر کی طرف سے بڑے دلچسپ تبصرے ملیں گے۔ ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ منشی محبوب عالم ایسا باہوش ادیب بھی

جب حکیم صاحب کو اپنے رسالے کی ایڈیٹری کے لیے موزوں پاتا ہو تو پھر یہ کیوں نہ اپنا پرچہ نکال لیتے۔ اسی دُھن میں یہ شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی کے پاس جا رہے تھے کہ راستے میں انھیں عبدالمجید سالک مل گئے۔ انھوں نے پوچھا۔

"حکیم صاحب کدھر؟"

"شفاء الملک کی خدمت میں حاضری کا ارادہ ہے۔"

"خیریت؟"

"ایک ادبی رسالہ نکالنے کا خیال ہے۔ مشورے کے لیے جا رہا ہوں۔"

"ان سے مشورہ بعد میں لینا۔ پہلے میرا مشورہ سنو اور وہ یہ کہ ادبی رسالہ نہ نکالنا۔ مارے جاؤ گے۔ ادبی پرچے نہیں چلتے۔ میں نے "فانوسِ خیال" میں ہزاروں کا نقصان اُٹھایا۔ فلاں نے فلاں پرچہ نکالا تباہ ہو گیا۔ فلاں نے فلاں پرچہ نکالا۔ پاگل ہو گیا۔ لہٰذا حکیم صاحب "آلو چھولے" بیچ لیجیے گا۔ پرچہ نہ نکالیے گا۔"

"اب میں نے جو ارادہ کر لیا ہے۔ اُس میں تباہی ہو یا بربادی، اپنے ارادے سے باز نہ آؤں گا۔ اور یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ پرچہ ایسا نکالوں گا کہ اس سے پہلے کے سارے پرچے گرد ہو جائیں گے۔"

سالک صاحب سے رخصت ہو کر میں شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اپنا عندیہ بیان کیا۔ انھوں نے دعا دی۔ "خدا تمھیں کامیاب کرے۔"

میں نے شفاء الملک سے درخواست کی۔ "رسالے کا نام تجویز فرما دیجیے"

"کیا کیا نام سوچے؟"

"دلچسپ"۔ "لالہ زار"۔ "نیرنگِ خیال"

شفاء الملک بڑے ماہر خطاط تھے۔ انھوں نے فرمایا۔ "اچھا نام وہ ہوتا ہے۔ جو لکھنے میں بھی اچھا لگے۔ میرے نزدیک تو ان میں سے "نیرنگِ خیال" سب سے بہتر ہے۔"

چنانچہ نیرنگِ خیال کا جو پہلا شمارہ نکلا۔ اس کا ٹائیٹل حکیم فقیر محمد چشتی کا لکھا ہوا ہے۔

اب رسالے کے متعلق، ان کے بنیادی نظریات بھی سُن لیں "میں نے ابتدا ہی میں چند باتوں کو دھیان میں رکھ لیا تھا۔ وہ یہ کہ میرا رسالہ دوسرے رسالوں سے مختلف ہو۔ بہتر ہو۔ مفید ہو۔ خوب صورت ہو۔"

تکمیل کی ابتدا یوں ہوئی تھی۔ عبدالرحمٰن چغتائی سے تصویر لی جس کا نام لیلیٰ تھا۔ اُسے پہلے شمارے میں بڑی شان سے چھاپا۔ اہتمام یہ بھی کہ کاغذ اچھا لگایا۔ کتابت عمدہ کرائی۔ چھپائی نفیس کرائی اور پھر یہ کہ مضامین بھی بڑے ادیبوں کے، پہلا پرچہ بازار میں آیا تو لوگ ٹھٹھکے۔ ایک شہر معارف آباد تھا پرچے ہیں، ہما شما کا تو ذکر ہی کیا۔ علامہ اقبال نے پہلے پرچے پر، اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا تھا:-

"رسالہ نیرنگِ خیال جو لاہور سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ بہت ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مضامین میں پختگی اور متانت پائی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ پنجاب میں صحیح ادبی ذوق پیدا کرنے میں بہت مفید ثابت ہوگا۔ ایڈیٹر دونوں (حکیم یوسف حسن ایڈیٹر، ڈاکٹر محمد دین تاثیر جائنٹ ایڈیٹر) نوجوان ہیں اور لٹریچر کی خدمت کا شوق رکھتے ہیں۔ جناب عبدالرحمٰن چغتائی کی تصویر تحفۂ لیلیٰ بہت خوب ہے۔ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے۔ دیکھیے اب تحفۂ قیس کب نکلتا ہے۔"

لاہور، ۱۷ اگست
۱۹۲۴ء
محمد اقبال

۱۹۲۴ء کے بعد پھر ۱۹۲۶ء میں بھی علامہ اقبال نے نیرنگِ خیال کی خدمات کو سراہا :-

رسالے کے مضامین اور تصاویر خوب ہیں۔ حکیم یوسف حسن کا انتخاب واقعی قابلِ داد ہے۔ غالباً نیرنگِ خیال کا سالنامہ اُردو رسائل میں سب سے اچھا ہے۔ نیرنگِ خیال کے خاص نمبروں نے تمام اُردو رسائل کو اپنا معیار بلند کرنے پر مجبور کیا ہے۔ بالخصوص ان کے ظاہری محاسن میں اضافہ

ہو رہا ہے۔ ملک کو حکیم صاحب کی اس مستعدی، بے دریغ زرافشانی
اور ذوقِ سلیم کی قدر کرنی چاہیے۔

جنوری ۱۹۲۶ء محمد اقبال

ان کا جو پہلا شمارہ نکلا۔ اس کے سرورق پر بجائے ۷۸۶ کے ۷۸۷
لکھا ہُوا ہے۔ بسم اللہ غلط تھی۔ مگر انجام بخیر ہُوا اور ہوگا۔ اب تک جو کچھ
سامنے آچکا ہے۔ وہ بھی حیران کُن ہے۔ وہ بھی ناقابلِ تسخیر ہے۔ وہ بھی
مستقبل کا سرمایہ ہے۔ اس لیے کہ اس کی ہر ہر سطر سے تفکر کی آنچ آتی ہے
نیرنگِ خیال کے پہلے شمارے کا جو اداریہ ہے۔ وہ بھی قابلِ توجہ
اس لیے ہے کہ اُسی سوچ پر تو ساری "عمارت" کھڑی ہے۔ اُسی پر تو
فکر و شعور کا سفینہ رواں ہے۔ اجازت دیجیے تاکہ وہ میں آپ کو
پڑھ کر سُنا دوں :-

پنجاب زندہ دلی کے لیے ضرب المثل ہُوا اور ہو کر رہ گیا
کوئی وقت تھا کہ قومی جدوجہد کے ہر شعبہ میں ہمیں سبقت حاصل
تھی، ہر مذہبی، معاشرتی اور ادبی تحریک میں ہمیں پیش روی کا
فخر حاصل تھا مگر ملکی انحطاط کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی زوال آتا
گیا۔ بلند ہمتی پستی کے ساتھ بدل گئی۔

ادبیات کی تاریخ میں پنجاب کا نام تا ابد ایک مخصوص شہرت

کے ساتھ زندہ رہے گا۔ اُردو پنجاب کے بطن سے پیدا ہوئی۔ تورانی[1] حملہ آوروں نے پہلے پہل یہیں بود و باش اختیار کی اور بھاشا یہیں نئے سانچے میں ڈھالی گئی۔ مگر حکومت کے تغیر کے ساتھ دہلی اور لکھنؤ زبان کے مرکز بن گئے اور اُردو اپنی سوتیلی ماں کی آغوش میں پرورش پاتی رہی اور یہ مواقفت یہاں تک بڑھی کہ پنجاب اجنبی قرار دیا گیا اور دہلی لکھنؤ والوں کی زبان ٹکسالی شمار ہونے لگی مگر انقلاب زمانہ نے وطنی حکومت کو تباہ کر دیا۔ اغیار نے قدرتاً بیگانگی برتی اور اس آزمائش کے وقت میں پنجاب مردِ میدان ثابت ہوا۔

دہلی اور لکھنؤ کے اکھاڑا بند ہر چند آوانے کستے رہے مگر پنجاب میں احیائے اُردو کی تحریک حیرت انگیز سُرعت کے ساتھ ترقی پکڑتی گئی تھوڑے ہی عرصے میں بے شمار اخبار اور رسالے شائع ہونے لگے اور تمام ملک نے غیر معمولی سرگرمی کا اظہار کیا۔ یہ علامہ اقبال اور مخزن کا دور تھا۔ مگر اقتصادی اور معاشرتی

---

[1] اُردو سلطنت مغلیہ کے عہد میں پیدا نہیں ہوئی۔ اس زبان کی پیدائش کے تمام اسباب پہلے بھی بوجہ اتم موجود تھے۔ وَلی جسے غلطی سے اردو کا پہلا شاعر کہتے ہیں۔ دکنی تھا جس سے اُردو کی عالمگیر شہرت کا اندازہ ہو سکتا ہے مگر اس سے پہلے دسویں صدی ہجری میں سلطان محمد علی قطب شاہ دکن صاحب کلیات تھا۔

تغیرات اپنا اثر دکھائے بغیر نہ رہے۔ جنگِ یورپ تمام ادبی تحریکات کے لیے پیغامِ قضا ثابت ہوئی۔ لیکن پنجاب پھر بیدار ہوا۔ قومی نشوونما کے ساتھ ادبی ترقی بھی ہونے لگی اور پھر رسائل جاری ہونے لگے۔

گرم صد بار سوزی باز بر گردِ سرت گردم
منم پروانہ کز یک سوختن از دست و پا رفتم

یہ مرمر کے جینے کی سرگزشت پنجاب کی ادبی شیفتگی کی ادنیٰ ترین مثال ہے۔ چاہیے تھا کہ ماہوار رسائل ان تجربات سے کچھ فائدہ حاصل کرتے۔ گزشتہ شب کی گرمیٔ صحبت نے جو پروانوں کا ڈھیر چھوڑا تھا اگر اسے آنے والی صبح کی تعمیر میں صرف کرنا دشوار تھا تو اس سے مشعلِ ہدایت کا کام لینا محال نہ تھا۔ مگر افسوس ہے کہ ہمارے رسائل نے انگریزی میگزینوں کی کورانہ تقلید ترک نہ کی اور محض ادبِ لطیف کی اشاعت اپنا مقصد بنا لیا۔ یہ روش نہ تو پبلک میں مقبول ہے اور نہ قوم کے لیے مفید اور نہ ہی ادبیات کی خدمت کرنے کا اعلیٰ طریقہ ہے۔ اُردو کے مشہور ادیب آزاد، شبلی، حالی، سرسید، محسن الملک ادبِ لطیف کے علمبردار نہ تھے۔ ہم ادبِ لطیف کو معیوب نہیں سمجھتے۔ ہمارے خیال میں ادبِ لطیف تہذیب زندگی کو

ایک جزو لاینفک ہے مگر اسے ادبیات کا واحد نصب العین تصور کرنا کسی طرح روا نہیں ہے ۔

من نگویم فرو بند لب از نکتۂ شوق
ادب از دست بدہ بادہ باندازۂ ہوش

ہم نے نیرنگِ خیال کا اجرا اردو ادبیات میں اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے کیا ہے ہمارا مدعا قوم کے احاطۂ نظر کو وسعت دینا ہے اور یہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ مہذب دنیا کے ہر شعبۂ خیال کو ادبی لباس میں پیش کیا جائے ۔ معاشرتی، مذہبی، تعلیمی، تاریخی غرض ہر قسم کے مضامین ہوں گے مگر اس تنوع کے ساتھ ساتھ ایک مقصدِ وحید ہر وقت پیش نظر رہے گا کہ ہر مضمون ایک ادبی تحریر ہو۔

جولائی ۱۹۲۴ء

یہ ہے وہ پہلی اینٹ جس پر ساری "عمارت کھڑی ہے ۔ یہ ہے وہ فکر و شعور کا انگڑائیاں لیتا ہُوا انداز، جس نے کارہائے نمایاں انجام دیے ۔ حکیم صاحب نے فرمایا "ادارت بڑا مشکل کام ہے بابا! یہ ہر کسی کے بس کا نہیں ۔ بعض اوقات علمیت اور قابلیت بھی کام نہیں آتی ۔ ذاتی سوجھ بوجھ کا بھی اس میں بڑا دخل ہے ۔ مثال کے طور پر لیلیٰ کے خطوط کا قصہ سنو ۔ یہ خطوط قاضی عبدالغفار نے سید امتیاز علی تاج کو بھیجے تھے —

کہکشاں[1] میں اشاعت کے لیے، مگر تاج صاحب نے انھیں نہ چھاپا۔ ان کا خیال تھا کہ فحش ہیں۔ ڈرتے تھے ۔ احتساب کی زد میں آ جاؤں گا ۔

مجھے تاج صاحب نے وہ خطوط، یہ کہہ کر دیے تھے ۔ "ہمت ہے تو چھاپ دیجیے ۔"

مَیں نے جواب دیا۔ "پڑھ کر عرض کروں گا۔"

مَیں وہ خطوط لے آیا۔ پڑھ ڈالے جیسے جیسے میں انھیں پڑھتا گیا۔ متاثر ہوتا رہا۔ جب کتاب ختم کر لی تو میں نے سوچا کہ ایسی کتاب اور اس نوع کی کتاب تو پورے ادب میں ہے ہی نہیں۔ انداز بے باکانہ ضرور ہے ۔ سو اس کا کوئی حل سوچنا چاہیے۔ دو چار دن سوچتا رہا۔ بالآخر فیصلہ یہ کیا۔ جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔ مَیں اسے چھاپوں گا ضرور!

حل یہ سوچا تھا کہ اُن خطوں پر مفصّل نوٹ لکھنا چاہیے اور بس! مَیں نے پہلی قسط کے طور پر، صرف تین صفحوں میں تو خطوط چھاپے اور اُن پر دو صفحوں کا نوٹ لکھا تھا کہ یہ خطوط فحش نہیں ہیں بلکہ عورت کی نفسیات کا نفیس ترین اور نازک ترین مطالعہ ہیں اور یہ بھی لکھا تھا کہ اُردو ادب میں اس انداز کی کوئی چیز نہیں ۔ وغیرہ وغیرہ!

---

[1] سیّد امتیاز علی تاج کا رسالہ، جو تھوڑا عرصہ نکلا ۔ مگر نکلا دھوم سے!

میرا خیال تھا کہ اگر میں نے وہ خطوط، بغیر کسی نوٹ کے چھاپ دیئے تو پرچہ ضبط ہو جائے گا چونکہ میں نے حصار باندھ دیا تھا۔ اس لیے بے خطر تھا کہ اب کچھ نہ ہوگا بلکہ اُلٹی واہ واہ ہوگی۔ چنانچہ وہی ہُوا۔ حکومت کو اعتراض کا موقع نہ ملا اور ادب میں دھوم مچ گئی۔ اگر میں بھی تاج صاحب کی طرح سوچنے لگ جاتا تو ہو سکتا تھا کہ وہ ادبی شاہکار ہماری مصلحتوں کے چکر میں ہمیشہ کیلئے دفن ہو جاتا۔

حکیم صاحب نے فرمایا۔ یہ وہ زمانہ تھا، جسے اُٹھتی جوانی کہتے ہیں۔ اس لیے میں ہر قسم کا خطرہ مول لے سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں ہر کسی سے ٹکرا بھی جاتا تھا۔ مجھے ادبی محاذ پر سبقت لے جانے اور دوسروں کو پچھاڑنے میں مزا آتا تھا۔ مگر مجھے اس امر کا افسوس ہے کہ میرا پہلا ادبی معرکہ دوستوں سے ہُوا۔ وہ یوں :۔

میرے ہاں اُٹھنے بیٹھنے والوں میں حفیظ جالندھری، ڈاکٹر تاثیر، غلام عباس اور بدر الدین بدر تھے۔ کبھی کبھی عبدالرحمٰن چغتائی بھی آن نکلتے تھے۔ خوب گپ بازی ہوتی تھی۔ جلیبیاں اور کباب اُڑتے تھے۔ چائے کے دور چلتے تھے۔ ادب پر باتیں اور بحثیں ہوتی تھیں یعنی خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ ہم سب ایک تھے۔

حفیظ صاحب کی دبی دبی خواہش یہ تھی کہ مجھے بھی نیرنگ خیال

کے ادارے میں شامل کر لیا جائے۔ میری سوچ یہ تھی کہ حفیظ صاحب
ہمیں اپنے شعری کارناموں سے تو نواز ہی رہے ہیں۔ اس لیے اس
تکلف کی ضرورت کیا ہے۔ مگر اس بات کو حفیظ صاحب نے بہت
محسوس کیا۔

اُدھر مولانا تاجور 'مخزن' سے علیحدہ ہو چکے تھے۔ مالکوں نے
مخزن بند کر دیا تھا۔ حفیظ صاحب مالکانِ رسالہ سے جا کر ملے۔ انھیں
اس بات پر آمادہ کر لیا کہ 'مخزن' کو دوبارہ نکالا جائے۔ ساتھ ہی اپنے آپ
کو ادارت کے لیے پیش کر دیا۔ وہ بھی بغیر تنخواہ کے!

وہ ساری پارٹی جس میں ڈاکٹر تاثیر، بدر الدین بدر، غلام عباس
اور چغتائی تھے۔ سب کے سب نیرنگِ خیال کے دفتر سے اُٹھ کر مخزن کے
دفتر پہنچ گئے۔ انھوں نے تہیہ یہ کیا کہ نیرنگِ خیال کا جنازہ نکال دیا
جائے۔ ادھر میں اکیلا رہ گیا تھا۔ اُدھر جنازہ نکالنے والے کئی تھے۔
یہ لوگ میرا جنازہ ضرور نکال دیتے۔ بشرطیکہ مجھ میں کوئی صلاحیت
نہ ہوتی یا میری ادبی موت واقع ہو جاتی۔ میں خود جیتا تھا۔ میرے عزائم
جیتے تھے۔ میری لگن جیتی تھی۔ میری سوجھ بوجھ جیتی تھی۔ اس لیے سب
کے سب اپنی خواہشوں میں بری طرح ناکام ہوئے۔

جن دنوں حفیظ صاحب نے مخزن سنبھالا تھا۔ اُن دنوں حفیظ صاحب

کا طوطی بولتا تھا۔ ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ان کے کلام کی دھوم تھی۔ نہ صرف دھوم تھی بلکہ حفیظ صاحب پُوجے جاتے تھے۔ شاعرِ اسلام جو تھے۔

اُن دنوں نیرنگِ خیال کی ادبی اہمیت کے ساتھ اس کی ایک خوبی یہ بھی گنی جاتی تھی کہ اس میں بہترین مصوّروں کی تصویریں چھپا کرتی تھیں، اس کے ساتھ پرچہ فوٹوگرافی کے بھی شاہکاروں سے آراستہ ہوتا تھا۔

حفیظ صاحب نے شہر بہ شہر جاکر، نیرنگِ خیال کی اس رُخ سے مخالفت کی کہ تصویریں چھاپنا خلافِ شریعت ہے۔ اس لیے نیرنگِ خیال کی وجہ سے مذہب خطرے میں پڑ گیا ہے۔

حکیم صاحب کا بیان ہے کہ اُن دنوں میں نے گیارہ ماہ کے بعد تاثیر کو اپنے دفتر میں دیکھا تھا اور یہ دن وہ تھا جس دن حفیظ صاحب کی ادارت میں نکلنے والا مخزن بند ہُوا تھا۔

نیرنگِ خیال کی دھوم، زیادہ تر اُن کے سالناموں کی وجہ سے تھی۔ ظاہری شان و شوکت بھی ایسی ہوتی تھی کہ دل کھنچتا تھا۔ خوب صورت ٹائیٹل کے ساتھ، متعدد رنگین تصویریں ہوتی تھیں۔ آج بھی اتنے خرچ کا تصوّر محال ہے۔ چہ جائیکہ اُن دنوں جب کہ لوگ سیدھے سادے انداز میں پرچہ چھاپنے کے عادی تھے۔ یہ اجتہاد انہی کا حصّہ تھا۔

حکیم صاحب پرچے کی آرائش پر، کس طرح بے دریغ روپیہ خرچ کرتے تھے۔ اُس کا ایک واقعہ انھوں نے یوں سنایا تھا :۔

"پرچے کو مصوّر بنانے کا شوق، جنون کی حد تک تھا۔ مَیں نے ایک دفعہ بازار میں رنجیت سنگھ پر انگریزی میں ایک کتاب دیکھی۔ قیمت پوچھی تو اس نے نوّے روپے بتائی۔ مَیں نے تھوڑے سے تامّل کے بعد کتاب خرید لی۔ اُس نوّے روپے کی کتاب میں سے تصویر پھاڑ کر، کتاب سیّد امتیاز علی تاج کو دے دی تھی۔"

وہ زمانہ آج کا نہ تھا۔ اُس وقت نوّے روپے کی بڑی قیمت تھی۔ صرف ایک تصویر کے لیے نوّے روپے خرچ کرنا آسان کام نہ تھا۔ واقعی وہ شوق نہ تھا۔ جنون تھا۔ شوق اور جنون میں صرف ایک ہی قدم کا فاصلہ ہے مگر اسے پھاندنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

اس ٹھاٹھ کا تو تھا اس کا ظاہری حسن، سفید کاغذ، بعض اوقات موجودہ رسالوں سے بڑا سائز، خوبصورت لکھائی، خوبصورت چھپائی۔ اس اہتمام سے اور اتنی تعداد میں اگر آج پرچہ چھپایا جائے تو کم از کم بھی نصف لاکھ روپیہ لاگت آئے گی۔ یہ تو تھی اس پرچے کی ظاہری شان، اب معنوی حیثیت بھی دیکھیے :۔

میرے سامنے اس وقت ۱۹۳۲ء کا سالنامہ ہے۔ اس کے قلمی

معاونین ہی سے اس کی ادبی حیثیت کا اندازہ کریجیے۔ اس سے زیادہ لکھوں گا تو نقاد حضرات کہیں گے۔ پھر آیا ہماری حدود میں! مختصر جائزہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ آپ حکیم صاحب کے خرچیلے مزاج کے ساتھ، ان کے ادبی رجحان کو بھی جان سکیں۔

مضمون نگاروں میں سے صرف چند نام لکھتا ہوں۔ وہ بھی بغیر کسی ترتیب کے، جنھوں نے سالنامہ ۱۹۳۴ء میں شرکت کی تھی اور اسے اپنے رشحاتِ قلم سے سنوارا تھا۔ مثلاً ڈاکٹر اقبال، سر عبدالقادر، عشرت لکھنوی، آغا حشر، عبدالمجید سالک، نیاز فتحپوری، ایم اسلم، منشی پریم چند، امتیاز علی تاج، محمود شیرانی، نصیر حسین خیال، حفیظ جالندھری، اختر شیرانی، نور الٰہی محمد عمر، سیماب اکبرآبادی، یگانہ چنگیزی، ڈاکٹر تاثیر، شوکت تھانوی، فراق گورکھپوری، قاضی عبدالغفار، عبدالسلام ندوی، سید سلیمان ندوی، عنفی لکھنوی، جگر مرادآبادی، ظریف لکھنوی، احسن مارہروی، عظیم بیگ چغتائی، سائل دہلوی، عزیز لکھنوی، ریاض خیرآبادی، ان کے علاوہ بھی بہت سے لکھنے والے تھے۔ سب کے نام کہاں تک گنواؤں۔ ابھی تو ایک لمبی فہرست، اسی ایک شمارہ کے مضمون نگاروں کی باقی ہے۔ جب ایسے ایسے لوگ لکھنے والے ہوں گے اور اتنے زیادہ لکھنے والے ہوں گے تو اس رسالے کی

ادبی قدر و قیمت کا اندازہ خود ہی کر لیجیے ۔ یہ سب کچھ چھو منتر کے زور پر نہیں ہو جاتا اور یہ بھی کہ ادبی اسرار کے قفل اُس وقت تک نہیں کھلتے۔ جب تک کہ کوئی عشق پیشہ اپنے لہو کی اِک اِک بوند کو نذر نہ کر ڈالے۔ اگر آپ کو میری باتوں پر یقین نہ آرہا ہو تو آئیے میں آپ کو اُس وقت کے نمایاں اکابرینِ ادب کی رائے بھی سنوا دوں ! حوصلے سے اسے بھی پڑھ لیجیے ۔ حکیم صاحب کو زمانہ نے دیا کیا ہے ۔ سوائے تحسین کے، سوائے واہ واہ کے جھولے کے !

مولانا ظفر علی خان نے فرمایا ۔

"اُردو ادب پر جو پنجاب نے احسان کیے ہیں، وہ زائد از حدِ شمار ہیں ۔ یہ خود ستائی نہیں ۔ خود غالب وانیس کے نام لینے والے معترف ہیں کہ جو کام دہلی اور لکھنؤ سے نہ ہو سکا۔ لاہور والوں نے کر کے دکھا دیا۔ صحافت کی موقت الشیوع صنف آج کل ادبیات کی جان سمجھی جاتی ہے اس صنفِ سخن میں پنجاب گریز پا ترقی کر رہا ہے اور متعدد بلند پایہ صحائف کا بدیع المنزلت وجود، اس پر گواہ، یوں تو ان میں ہر ایک گنجِ شایگان ہے ۔ لیکن میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ نیرنگِ خیال جس کا اہتمام حکیم یوسف حسن کے

باسلیقہ ہاتھوں میں ہے۔ ان سب کا سرتاج ہے۔ میرے سامنے
اس وقت نیرنگِ خیال کا وہ خاص نمبر ہے۔ جو سالنامہ کے نام
سے شائع ہوا ہے اور دو سو صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی
اٹھان کو دیکھ دیکھ کر میں حیران ہوں کہ اس کی ترقی کہاں جاکر
رُکے گی اور اس کی بے مثال خوبیوں پر نظر ڈال ڈال کر لسان الغیب
کی زبان میں بے اختیار پکار اُٹھتا ہوں کہ ؎

غبارِ خط بپوشانید خورشید رخش یارب
حیاتِ جاوداں بخشد کہ حُسنِ جاوداں دارد

ان چند سطروں میں سالنامہ نیرنگِ خیال کی واجبی ستایش کے
حق سے عہدہ برآ ہونا کسی طرح ممکن نہیں۔ معارف اور حقائق
کے رنگا رنگ جواہرات کا ایک ڈھیر ہے۔ جس کی چمک دمک
نگاہ کو خیرہ کیے دیتی ہے۔ نثر اگر دلکشا ہے تو نظم دلربا، اس
پر ایک دو نہیں اکٹھی ۳۲ تصویریں، جو صنعت گری کی جان ہیں
سونے پر سہاگہ ہیں۔ اور لطف یہ کہ باوجود ان تمام محاسن کے
سالانہ بدلِ اشتراک صرف چار روپے بارہ آنے، آپ خود ہی
اسے پڑھیے اور اس کی خوبیوں کا اندازہ لگا لیجیے ؎
ہے جو شوقِ جلوۂ حسن زلیخائے ادب   دیکھیے یوسف حسن سے لے کے نیرنگِ خیال
جنوری ۱۹۲۸ء

یہ اُس شخص کی رائے ہے جسے لوگ بابائے صحافت کہتے ہیں۔ یہ ادیب ایسے تھے کہ بڑے بڑے ادیب پانی بھرتے تھے۔ شاعر ایسے تھے کہ ہر مصرعہ پر مرحبا کہنے کو جی چاہتا تھا۔ لیڈر ایسے تھے کہ ساری قوم لبیک کہتی تھی۔ اللہ اللہ کیا شان تھی ان کی، درۂ خیبر سے لے کر راس کماری تک ان کے کارناموں کی دھوم تھی، ان کے جوش و خروش کی دھوم تھی۔ مگر ہُوا کیا آنکھیں بند ہوتے ہی قوم نے انہیں بھی طاقِ نسیاں پر رکھ دیا۔ اے دوستو! ذرا سوچو تو، جو شخص ساری عمر آپ کی بہتری کے لیے سرگرداں رہا ہو۔ کیا اُس کا انعام یہی کچھ ہے؟ زوالِ آدمیت کی حد ہو گئی!

یوں تو نیرنگِ خیال پر سارے ہی بڑے ادیبوں نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا تھا اُن سب کا بیان کہاں تک ہو مگر میں آپ سے گزارش کروں گا کہ ایک دو نامور ادیبوں کی۔ رائے ضرور سُن لیں۔ آپ کا کچھ حرج نہیں۔ خدمت گزار کی اشک شوئی ہو جائے گی۔

مولانا وحید الدین سلیم نے فرمایا:۔

آپ کا ہر رسالہ اپنے سابقہ رسالے سے بہتر اور برتر نکل رہا ہے اور ہر ایک رسالے میں آپ کسی جدت کے نمایاں کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ بڑا کام جو آپ نے کیا ہے وہ یہ

ہے کہ آپ نے مضمون نگاروں کا ایک گروہ کھڑا کر دیا ہے
جن کی تحریروں میں زندگی اور جذبات کی جھلک ہے۔ میری
ابتدا سے یہی رائے تھی کہ نوجوانوں میں مذاقِ ادب پیدا کیا جائے
پرانے مضمون نگاروں سے بھیک مانگنے کا شیوہ ترک کر دینا
چاہیے۔ ان میں کام کی قوت اور زندہ دلی کا جوش فرو ہو گیا
ہے۔ الحمد للہ کہ آپ نے میرا منشا پورا کر دکھایا۔ فنونِ لطیفہ
پر جو خاص توجہ آپ نے کی ہے۔ وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔
کسی رسالے نے آپ سے پہلے اس میدان میں قدم نہیں اٹھایا تھا۔"

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے فرمایا:

"نئے نئے رسالے نکلتے ہیں اور بھانت بھانت کی جدتیں کرتے
ہیں مگر حکیم یوسف حسن صاحب کو کد ہے کہ ان سے کوئی بازی
نہ لے جائے اور سچ یہ ہے کہ ان کا پلّہ ہمیشہ بھاری رہتا ہے۔
سال بھر اپنے سالنامے کی دھن میں رہتے ہیں۔ شہد کی مکھی
کی طرح پھول پھول سے رس جمع کرتے ہیں اور وقت آنے پر
ایسا بھاری بھرکم رسالہ نکالتے ہیں کہ تعریف کرتے ہی بنتی ہے
مضمونوں کی پوچھیے تو یہ گویا ایک فرش ہے۔ جس پر پچی کاری
کی گئی ہے۔ الگ الگ کر کے دیکھیے تو کوئی ٹکڑا ڈھنگ سے

تماشا گیا ہے اور کوئی ٹیڑھا بنگا، مگر سب کو ملا کر دیکھیے تو آنکھوں
کو راحت معلوم ہوتی ہے۔ نیرنگِ خیال کے احسانات اُردو
صحافت پر بہت زیادہ ہیں۔ اس کی اشاعت اور مقبولیت
ہماری زبان کی ترقی کا باعث ہوگی۔"

ایسا رسالہ جس کی شان میں علامہ اقبال، مومن، ظفر علی خان،
عبدالمجید سالک، وحیدالدین سلیم اور مولوی عبدالحق ایسے اکابر بھی مرحبا
کہتے ہوں تو اس کے بارے میں یہ سوچا جا سکتا ہے کہ یہ رسالہ بہت بڑے
سرمائے سے نکلا ہوگا۔ مگر یہ جان کر حیرت ہوئی کہ یہ رسالہ تو سرمائے
کی تہمت سے بالکل ہی بے نیاز نکلا۔ سوائے سینے میں روشنی کی دولت
کے ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ حقیقتِ حال سنیے گا؟

"ابتدا میں تو آپ نے خوب سرمایہ لگایا ہوگا۔"

"بالکل نہیں۔"

"پھر بھی؟"

"ایک پیسہ بھی نہیں۔"

"تو پھر پرچہ نکلا کیسے؟"

"قرض سے۔"

"کے ہزار کے؟"

"صرف چھ سو سے۔"

"صرف چھ سو؟"

"ہاں صرف چھ سو روپے سے، وہ بھی پرچے کے اجرا کے چوتھے مہینے واپس کر دیے تھے۔ اُن دنوں میرے پاس اگر کوئی سرمایہ تھا تو وہ صرف میرا عزم تھا۔"

پھر یہ بھی فرمایا اور میں منہ کھولے سُنا کیا! :۔

"مالی اعتبار سے پرچے پر کئی بُرے دور آئے مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ مشکلیں آتی رہیں۔ تدبیریں کام کرتی رہیں۔ جب تدبیر بھی کام نہ آئی تو قدرت نے ساتھ دیا۔

ایک بار یہ ہُوا کہ ایک سالنامہ چھپا ہُوا بالکل تیار پڑا تھا۔ مگر پریس کے مالک نے پرچہ اٹھوانے سے انکار کر دیا۔ میرا جتنا بھی سرمایہ تھا وہ تو اس میں لگ چکا تھا۔ مگر میرے لگے ہُوئے سرمائے سے، خرچ زیادہ آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پریس کے مالک نے کہا۔" رقم دیجیے جناب!"

"میرا سرمایہ تو اس میں لگ چکا ہے۔ اگر آپ نے تعاون نہ کیا تو میں کسی صورت بھی آپ کی رقم ادا نہ کر سکوں گا۔"

"پھر ہوا کھایئے۔"

"ہوا کھا تو لوں مگر اس سے نہ میرا مسئلہ حل ہو گا نہ آپ کا۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔"

فوراً ایک ترکیب سُوجھی، "آپ سات ہزار پرچوں کے ایک ایک سو کے ستّر پیکیٹ بنالیں۔ مَیں ایک ایک پیکیٹ آپ سے نقد رقم ادا کر کے لیتا رہوں گا اور اس طرح سارا پرچہ اٹھالوں گا۔"

پریس کا مالک مان گیا۔ میری بھی مشکل آسان ہوگئی۔ اس لیے کہ پرچے کی بے حد مانگ تھی۔ لوگ ہاتھوں ہاتھ لے گئے۔ یوں قرض اُتر گیا۔ میں سرخرو ہوگیا۔"

ایک اور واقعہ سنو:۔

"جب نیرنگِ خیال کا طوطی بولتا تھا۔ اُس وقت بھی میں پریشان حال تھا۔ رسالے سے جتنا روپیہ آتا تھا۔ اُس پر مَیں اُس سے زیادہ خرچ کر ڈالتا تھا۔ اگر مَیں یہ سوچتا کہ اس رسالے سے مجھے کچھ کمانا ہے تو پھر مَیں یہ پرچہ نکال ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر نکال سکتا تو اس شان سے نہ نکال سکتا۔ آج میرے پاس سرمایہ نہیں۔ مگر یہ اطمینان تو ہے کہ کہ مَیں نے ادب کی دنیا میں آکر، اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔ بلکہ رسائل کی دنیا میں قابلِ توجہ کام کیا ہے۔

معلوم ہُوا کہ کسی سالنامے کے لیے' ان کے پاس اتنا سرمایہ نہ تھا

کر اُسے چھاپ سکتے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے طور پر یہ سوچا کہ لاہور سے نکلوں۔ ایجنٹوں سے روپیہ وصول کروں اور سالنامہ چھاپوں، اس خیال سے دلّی پہنچے۔ ایجنٹوں سے ملے مگر خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ یعنی جو کچھ ملا۔ اُس سے ہوٹل کا کرایہ بھی پُورا نہ ہُوا۔"

کہا! — "ان حالات میں بھی، مَیں مایوس نہ ہُوا۔ انسانوں نے ساتھ نہ دیا تو بزرگوں کے پاس پہنچا۔ پہلے دن نظام الدین اولیاؒ کے مزار پر حاضری دی۔ دوسرے دن بختیار کاکیؒ کے مزار پر، تیسرے دن خواجہ باقی باللہؒ کے مزار پر، چوتھے دن سید حسن رسول نما کے مزار پر، پانچویں دن مولانا جمالیؒ کے مزار پر، جب مَیں ان بزرگوں کے مزار پر جاتا تو ان سے یہ کہتا۔ آپ میری خدا سے سفارش کریں اور مجھے روپیہ دلوائیں۔"

ان کا بیان ہے کہ جب میں پانچویں دن ہوٹل میں واپس آیا تو ایک تار رکھا تھا۔ جس میں لکھا ہُوا تھا۔ "آپ آکر اپنا ایک ہزار روپیہ وصول کرلیں۔"

بعض "روشن خیال" حضرات اس واقعہ کو توہم پرستی سے تعبیر کریں گے گَیں نے خود یہ دیکھا ہے کہ بعض اوقات علم اور تجربہ دھرا رہ جاتا ہے اور خدائی کرشمے اپنا آپ منوا لیتے ہیں۔

انہوں کی "توہم پرستی" کی ایک اور بات سُنا دوں؟ جی تو نہیں چاہتا کہ

آپ ایسے "عقل والوں" سے ایسی باتیں کروں مگر یوں ہوتا تو ہے۔

ادبی رسالوں کے مقدر میں یہ لکھ دیا گیا ہے کہ جو چاہو مانگو ملے گا مگر ایک چیز نہ مانگنا اور وہ ہے مالی آسودگی! یہی وجہ ہے کہ ہزاروں ہی رسالے، اپنے اپنے خون میں نہا کر بے چارگی کی گھاٹیوں میں جا سوئے۔ قدرت کے اس فیصلے کے مطابق حکیم صاحب بھی تہی دامن ہی رہے۔ ہمیشہ تہی دامن! چھوٹے موٹے شمارے تو یہ آسانی سے نکال لیتے تھے۔ مگر جب سالنامے کی اشاعت کا موقع آتا تھا تو جمع جتھا ساتھ نہ دیتا تھا۔

ایک بار یہ ہُوا کہ یہ ہندوستان کا چکر لگا کے، سالنامے کے لیے مضمون اکٹھے کر چکے تھے۔ سالنامے کی کتابت ہو چکی تھی مگر اتنا سرمایہ نہ تھا کہ کاغذ خرید کر پرچہ چھپوا لیتے۔ بتیری کوششیں کیں۔ سب ناکام۔ ادھار مانگا، وہ نہ ملا۔ عموماً ایسے مواقع پر، دوست بھی مالی اعتبار سے "ننگے" نکلتے ہیں۔

جب اپنی کوششوں کا جائزہ لے کر، اُس کے نتیجے پہ سوچا تو ان کے آنسو نکل پڑے۔ انھوں نے کمرہ بند کر کے کنڈی چڑھالی۔ سجدے میں گر گئے۔ زار و قطار روتے رہے۔ روتے جاتے تھے اور یہ کہتے جاتے تھے۔ "اے اللہ! مَیں اپنی ذات کے لیے روپیہ نہیں مانگتا۔ مَیں اپنے طور پہ جو کام کر رہا ہوں وہ مخلوقِ خدا کی بھلائی کے لیے ہے۔ پھر کیوں تُو میرا ساتھ نہیں دیتا؟"

حکیم صاحب کے بیان کے مطابق، یہ کوئی گھنٹہ بھر سجدے میں گرے

رہے اور یہی کچھ کہتے رہے۔ بڑے ہی جذب کے ساتھ!

اتنے میں کسی نے کُنڈی کھٹکھٹائی۔ انھیں بڑا غصّہ آیا۔ یہ نہیں چاہتے تھے کہ اُس وقت کوئی اِن کا اور خدا کا رابطہ توڑے۔

جب کنڈی مسلسل کھٹکتی رہی تو منہ پونچھ کے غصّے سے اُٹھے "کیا ہے؟" انھوں نے دیکھا کہ دروازے پر گیلانی پریس کے مالک، سفید ریش بزرگ کھڑے تھے اور سڑک پر ان کے ننّھے سے گھوڑے والی ننّھی سی ٹمٹم کھڑی تھی۔

"آئیے شاہ صاحب!"

"مَیں یہاں سے گزر رہا تھا۔ سوچا آپ کو سلام کرتا چلوں۔"

"زہے نصیب!"

"آپ کاغذ کہاں سے خریدتے ہیں؟"

"جہاں سے ملے۔"

"ہم سے لیا کریں۔"

"مَیں تو کاغذ اُدھار لیتا ہوں۔"

"ہم بھی اُدھار دے دیں گے۔ ہر ماہ کتنا کاغذ درکار ہوتا ہے؟"

"کوئی چار سو روپے کا!"

"بہت اچھا! فی الحال مَیں آپ کو چار ہزار روپے کا کاغذ بھجوا دیتا

ہوں۔ جب جی چاہے اور جتنی رقم دے سکیں۔ وہ دیتے رہیں۔ ہماری طرف سے کوئی شرط نہ ہوگی۔"

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ "میری زندگی کے یہ دو چار واقعات ایسے ہیں جنھیں میں کبھی فراموش نہ کرسکوں گا۔ مادی دنیا کے لوگ اسے محض اتفاق کہیں گے مگر میں یوں سوچ نہیں سکتا۔ میں اتفاقات کو بھی خدائی وسیلہ سمجھتا ہوں۔ کسی کو قدرت خود نواز دیتی ہے۔ کسی کو درخواست کرنی پڑتی ہے۔"

میں نے حکیم صاحب سے کہا۔ "آپ روپے پیسے کے لیے خواہ مخواہ پریشان رہے۔ وہ دَور تو ایسا تھا کہ ادب کی سرپرستی امراو رؤسا کی "ہوبی" تھی۔ آپ نے کیوں نہ فائدہ اُٹھایا؟"

کہنے لگے۔ "یہ وصف مجھ میں نہ تھا۔ میں کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلا سکتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ ہاتھ نہیں پھیلا سکتا تھا بلکہ اکثر یہ ہُوا کہ اپنا حق بھی حاصل نہ کرسکا۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ سر عبدالقادر، ریاست بہاولپور کے چیف جسٹس تھے۔ انھوں نے سوچا بہاولپور میں ایک بڑے پیمانے پر مشاعرہ کرایا جائے۔ صدارت کے لیے نواب صاحب راضی ہوگئے۔ نواب صاحب راضی کیوں نہ ہوتے۔ اسکیم سر عبدالقادر کی تھی۔ صاد نواب صاحب نے کیا ہُوا تھا۔

مجھے خط لکھ کر سر عبدالقادر نے بہاولپور بلایا۔ پہلے مقصد بتایا۔ پھر وزیرِ تعلیم سے ملوایا اور اُن سے میرے پہنچنے کی غرض و غایت بیان کی۔

غرض و غایت یہ تھی کہ میں نیرنگِ خیال کا مشاعرہ نمبر نکالوں جس میں اس مشاعرے کا حال بھی ہو اور امرأ و وزراء کا تعارف بھی اور نواب صاحب کی صلاحیتوں اور فیاضیوں کا ذکر بھی۔

چنانچہ اس غرض کے لیے تین چار بار بہاولپور گیا۔ پہلے مشاعرے کا حال نوٹ کیا۔ پھر امرأ و وزراء کے فوٹو اور حالات اکٹھے کیے۔ غرض خوب محنت کی۔"

حکیم صاحب کے بیان کی روانی میں میں نے پوچھ لیا۔ "جناب! یہاں مجھے یہ بتاتے چلیں کہ اس مشاعرے میں شرکت کن کن شعرأ نے کی تھی؟"

کہنے لگے۔ "مولانا ظفر علی خان، دل شاہ جہان پوری، سیماب اکبر آبادی، جوشی محمد ناظر، تلوک چند محروم، جوش ملسیانی، شعری بھوپالی، روش صدیقی، شکیل بدایونی اور نہ جانے کون کون! غرض شاعر اتنے تھے کہ چار دن تک مشاعرہ چلا تھا۔

شاعروں کی آؤ بھگت بھی بڑی ہوئی۔ شاہی محل میں خود نواب صاحب نے مدعو کیا۔ کھانا ساتھ بٹھا کے کھلایا۔ غرض وہ مشاعرہ یادگار تھا۔ نہ کبھی ایسا مشاعرہ ہوا ہو گا اور نہ ہو گا۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے بڑی محنت کر کے نیرنگِ خیال کا مشاعرہ نمبر

چھپا یا تھا۔ جب نمبر چھپ گیا تو مجھے سر عبدالقادر نے پھر بہاولپور بلایا۔ اس وقت وزیر تعلیم بھی موجود تھے۔ سر عبدالقادر نے کہا۔ حکیم صاحب! آپ نے جو اہلِ بہاولپور کی خدمت کی ہے وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ اس موقع پر ہم چاہتے ہیں کہ کچھ آپ کی بھی خدمت کریں۔"
میں نے سر عبدالقادر کی باتوں پر سوچا۔ معاً میرے ضمیر نے آواز دی۔ مانگنا ہے تو خدا سے مانگ۔ چنانچہ میں نے ان سے گزارش کی میرے صرف ساڑھے آٹھ سو روپے خرچ ہوئے ہیں

"صرف ساڑھے آٹھ سو ؟"

"جی ہاں !"

"سوچ لیجیے"

"سوچ لیا"

چنانچہ مجھے ساڑھے آٹھ سو روپے ادا کر دیے گئے۔ بعد میں سر عبدالقادر نے کہا کہ اس موقع پر، جبکہ نواب صاحب بھی بے حد خوش تھے۔ آپ کو آٹھ دس ہزار روپیہ مل جانا کوئی بڑی بات نہ تھی مگر آپ نے صرف خرچہ مانگا۔ اپنی زحمتوں اور کارگزاریوں کا کچھ نہ مانگا۔"
جواب میں حکیم صاحب نے کہا۔ "مانگنے کے لیے میں نے جس کا انتخاب کر رکھا ہے وہ نواب صاحب بہاولپور نہیں۔"
جب میں نے حکیم صاحب کی یہ بات سُنی تو وہ خیال بھی آیا کہ حکیم صاحب جو کنڈی لگا کر خدا سے مانگتے ہیں تو وہ غلط نہیں مانگتے۔

انھوں نے نہ کبھی سگریٹ پیا اور نہ شراب، حالانکہ ادیب برادری
پہ کہتی ہوئی پائی گئی ہے کہ سگریٹ پینے سے خیالات کا نزول ہوتا ہے۔
ہوگا۔ اپن کو تو اس کا تجربہ ہی نہیں۔ لہٰذا ایک اناڑی بولے بھی تو کیا
بولے!

پھر بعض شاعر اور ادیب شراب پی کر بہکنے ہی میں اپنی شان
سمجھتے ہیں۔ جو اس شعلۂ دار و سے رغبت نہیں رکھتے۔ اُن پہ آوازے
کسے جاتے ہیں۔ انھیں "بچہ پارٹی" کا خطاب دیا جاتا ہے۔ اس اعتبار
سے یہ بھی ۷۵ — ۷۶ برس کے بچے ٹھہرے!

نیرنگِ خیال کے دوسرے رسائل کے ساتھ بھی بڑے معرکے رہے
حکیم صاحب کسی زمانے میں تھے بٹی جیوٹ، ہر ادبی معاملے میں اپنی چودھراہٹ
قائم رکھنا چاہتے تھے۔ پھر تھے بھی نیرنگِ خیال ایسے عظیم رسالے کے
ایڈیٹر، یہ نشہ کچھ کم نشہ نہ تھا۔

ایک چپقلش جو ہمیشہ ہی چلی۔ وہ تھی لکھنؤ اسکول اور دلّی اسکول
کی۔ ایک اسکول کہتا تھا۔ زبان ہے خیالات نہیں تُف! دوسرا کہتا تھا۔ خیال ہو تو
ہو، زبان کا بیڑا غرق ہوگیا۔ تھُو!

ان دونوں اسکولوں کی آپس میں کبھی نہ بنی، مگر جب بھی بنی تو اس
بنیاد پر، اہلِ پنجاب کے لتے لینے کو، ادھر بھی حکیم یوسف حسن تھے۔

سو ہنگاموں کے ایک ہنگامہ!

بھیے رن پڑا۔

یو۔پی کے دوستوں نے پنجابیوں کی زبان پر اعتراض کیا۔ اعتراض نہیں اعتراضات!

پنجابی بھی سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ہنگاموں کا مرکز حکیم یوسف حسن کا دفتر (بلکہ اڈا) سرخیلوں میں پطرس، تاثیر، سالک اور تاج، اس پارٹی کے ذمے تھا اعتراضات کا جواب دینا اور نئے شوشے چھوڑنا۔

ان کے مددگاروں میں تھے حفیظ جالندھری، ہری چند اختر، غلام عباس بدر دین بدر اور حکیم یوسف حسن، ان کے ذمہ تھا ایسا مواد اکٹھا کرنا جو دشمنوں کے خلاف استعمال کیا جا سکے۔

جب یہ لوگ اس "کارِ خیر" میں شرکت کے لیے اکٹھا ہوتے تھے تو عموماً آپس میں اس قسم کی گفتگو کرتے تھے۔

"پٹ گئے ہم۔"

"اب دشمن بھی جانے نہ پائے۔"

انہی دنوں رسالہ نگار میں ایک سوال چھپا تھا۔ البانیہ کہاں ہے؟ حدود اربعہ کیا ہے؟ آبادی کتنی ہے؟ سیاسی اعتبار سے اس کی پوزیشن کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ!

اس سوال کے چھپنے کے دوسرے مہینے انبانیہ پر ایک بڑا لمبا چوڑا مضمون نیاز فتحپوری کا نگار میں چھپا۔ سبھی اس معلوماتی مضمون سے متاثر ہوئے۔ مگر "کھوجیوں" نے سراغ لگایا کہ یہ مضمون تو حرف بہ حرف ترجمہ ہے امریکن میگزین کے ایک مضمون کا۔ اسی طرح کھوجیوں نے نیاز صاحب کی ایک دو چوریاں اور پکڑیں تو نیاز صاحب نے ہتھیار ڈال دیے۔ وہ اس ترکیب سے کہ اپنا ایک مضمون نیرنگِ خیال میں اشاعت کے لیے بھیج دیا اور اس کے ساتھ خط اس مضمون کا لکھا "یہ مضمون نہیں ہے۔ خراجِ عقیدت ہے"

اس طرح حامد اللہ افسر نے کسی مضمون کا ترجمہ کر کے اپنے نام سے چھپوا دیا۔ اس کو بھی یاروں نے پکڑ لیا کہ یہ فلاں مضمون کا ترجمہ ہے۔ اس کا جواب ادھر سے یوں دیا گیا کہ نیرنگِ خیال میں ایک ڈراما چھاپا گیا۔ دو قسطوں میں، جس میں ڈرامے کے کرداروں کے ذریعے جھوٹ اگلوایا گیا۔ وہ ڈراما کیا تھا۔ چوری پر بڑا کٹیلا طنز تھا۔ حامد اللہ افسر کی بھد اُڑی چنانچہ اس طنز کی تاب نہ لا کر انھوں نے بھی فوراً معذرت چاہی صلح صفائی ہو گئی۔

جس طرح ادھر کے چودھری حکیم یوسف حسن تھے۔ اُدھر کے چودھری شاہد احمد دہلوی تھے۔ وہ اپنے پرچے میں پنجاب کے اہلِ قلم کی زبان درست کرتے اور کراتے تھے۔ اِدھر یہ ان کی چوریاں پکڑ پکڑ کے رسالوی رپٹ لکھواتے رہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو کہتے تھے "نیاز مندانِ لاہور" دلّی کا رسالہ "ساقی"

انھیں کتا تھا— شلوارانِ ادب!"

واہ واہ کیا دن تھے وہ بھی اور کیا لوگ تھے وہ بھی، اُن میں سے پطرس، تاثیر اور سالک چل بسے۔ دوسری پارٹی سے نیاز فتحپوری، سیماب اکبرآبادی، اور شاہد احمد دہلوی چل بسے، پالی خالی ہوگئی۔ اب بوڑھے خلیفہ کے روپ میں حکیم صاحب زندہ ہیں، خدا انھیں سلامت رکھے۔

وہ جو میں نے ابھی کہا کہ انھیں چودھری بننے کا شوق ہے تو وہ غلط نہ تھا۔ اس شوق میں یہ نہ اپنوں کو بخشتے تھے نہ پرائیوں کو، جس نے سر اٹھایا نہیں۔ اُسے نیچا دکھایا نہیں۔

یہ کسی بات پر پطرس سے ناراض ہوئے تو ان کے خلاف لکھنا شروع کردیا۔ براہ راست نام لے کر تو نہ کوسا، مگر یہ لکھا ریڈیو والے بڑا غلط کام کر رہے ہیں۔ (اُن دنوں پطرس ریڈیو کے ڈائریکٹر جنرل تھے) پروگرام بڑے بیہودہ ہوتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ریڈیو کے ناخداؤں سے بازپرس کی جائے۔ پطرس ان کے ساتھیوں میں سے تھے۔ وہ حکیم صاحب کے ہتھکنڈوں سے واقف تھے۔ انھوں نے انھیں فوراً خط لکھا۔ "مَیں سارے جہان کا مقابلہ کرسکتا ہوں مگر نیرنگِ خیال کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہ اس پر بھی مطمئن نہ ہوئے۔ انا بُری بلا ہے۔ دوبارہ لکھا۔ لہجہ پہلے سے بھی زیادہ تند و تیز اختیار کیا۔ اس کے جواب میں پطرس نے پھر لکھا۔ "اگر آپ نے میری مخالفت بند نہ کی تو مَیں مرجاؤں گا۔"

اگر آپ پطرسؔ کے مزاج سے واقف ہیں۔ ان کے پندار سے آگاہ ہیں تو پھر پطرسؔ کا یہ فقرہ حکیم صاحب کے اثر اور دبدبے کو ظاہر کرنے کے لیے، ایک بہت بڑا سرٹیفکیٹ ہے۔ اس لیے کہ پطرسؔ اپنے وقت کے خدا تھے۔

یہ واقعہ بھی معلوم ہُوا کہ :۔

مولانا چراغ حسن حسرتؔ دل محمد روڈ پر رہتے تھے۔ حکیم صاحب کا دفتر فلیمنگ روڈ پر تھا۔ بالکل قریب قریب، حسرتؔ صاحب اُن دنوں ہفت روزہ "شیرازہ" نکالتے تھے۔ مولانا بلاشبہ، بڑے پائے کے ادیب تھے۔ ادب میں بڑا اونچا مقام تھا مگر اُن میں ایک بڑی خرابی تھی کہ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ حقائق سے آنکھیں چُرا لیا کرتے تھے ہر ایک کا تمسخر اڑایا کرتے تھے۔ ہر ایک میں کوئی نہ کوئی نئی نکالا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن انھوں نے اپنا وہی رنگ ان پر بھی جمانا چاہا۔ یہ بھی ذہن پر غلاف چڑھائے ہوئے نہ تھے۔ نک چڑھے تھے۔ خاموش کیسے رہتے۔

حسرتؔ صاحب نے فرمایا :" مولانا اپنے پرچے کو بہتر بنایئے۔ رسالے کو ترقی دیجیے۔ کیوں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔"

یہ سُن کر حکیم صاحب آگ بگولا ہو گئے۔ انھوں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دے ڈالا :" حضرت پہلے اپنے گھر کی تو خبر لیجیے۔ محاوروں کے بنڈل اب نہیں چلتے۔ نیوز ایجنٹوں کے ہاں سے پرچہ سیدھا ردّی کے بیوپاریوں کے

ہاں پہنچ رہا ہے۔"

حکیم صاحب میں باوجود بڑھاپے کے حد درجہ شگفتگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہر محفل میں فٹ نظر آتے ہیں۔ بوڑھوں میں بوڑھے، جوانوں میں جوان، بچوں میں بچے!

۱۹۴۴ء کا واقعہ ہے کہ ان کے پاس ایک صاحب آئے۔ اصل میں وہ نیرنگِ خیال میں کام کرنا چاہتے تھے۔ بھئے گنی، سیدھی طرح بات کرنے کی بجائے، گھما پھرا کر بات کرنی چاہتے تھے۔ یہ فوراً تاڑ گئے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ صاحب گویا ہوئے "حکیم صاحب پرچے کو اُٹھائیے۔"

"بہت اچھا۔"

"صرف اچھا کہہ دینے سے بات نہ بنے گی۔ جب تک ــــ"

"محنت کرتا ہوں، روپیہ خرچ کرتا ہوں اور کیا کروں؟"

"نہیں صاحب کچھ کیجیے۔"

"جو کچھ میرے بس میں ہے وہ تو کر ہی رہا ہوں۔"

"بہرحال کسی طرح پرچے کو اُٹھائیے۔"

"بہت اچھا دو آدمی اور لے آئیے تاکہ اسے اُٹھایا جائے۔" یہ سننا تھا کہ وہ صاحب ایسے بھاگے، جیسے شکاری سے شکار!

باتوں باتوں میں مولانا اظہر دہلوی کا ذکر آیا۔ حکیم صاحب نے کہا

اظہر صاحب بھی عجیب آدمی تھے۔ تھے تو قابل مگر جتنے قابل تھے باتیں اس سے بھی بڑھ چڑھ کر کرتے تھے۔ جھک جھک، جھک جھک!

ایک بار انھوں نے اپنے پرچے "تحریک" میں نیرنگِ خیال کی چند منظومات پر تبصرہ کر ڈالا۔ تبصرہ کچھ اس قسم کا تھا کہ فلاں نظم اور غزل میں یہ غلطی ہے اور فلاں نظم اور غزل میں یہ، غرض انھوں نے اچھا خاصا لتاڑا۔ نکو بنایا۔

اُن دنوں نیرنگِ خیال کا دفتر مستی گیٹ میں تھا۔ نیچے دفتر تھا۔ اور اس کے اُوپر بیٹھک، مَیں بیٹھک میں بیٹھا ہُوا تھا کہ مجھے بازار میں جاتے ہُوئے اظہر صاحب نظر پڑ گئے۔ میں نیچے اُترا۔ سلام علیک کہا۔ ساتھ چل دیا۔ پہلے تو میں نے خیر خیریت پوچھی، پھر احوال۔ چلتے چلتے میرا لہجہ تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا۔ مولانا بھانپ گئے۔ وہ کنّی کترانا چاہتے تھے میں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ غرض وہ میری شکایتوں کی آنچ سے بچنا چاہتے تھے

جب ہم مستی دروازے سے چل کر چوک سُرجن سنگھ تک آئے، تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ مولانا بھاگ کھڑے ہوُئے مگر میں نے ان کے بھاگنے کی ابتدا ہی میں یہ فقرہ جڑ دیا۔ "آیندہ ایسی حرکت کی تو گردن سے پکڑ کر نالی میں گھسیٹ دوں گا۔"

مَیں نے کہا۔ "حکیم صاحب! یہ تو آپ نے بڑی زیادتی کی۔ کہنے

لگے۔ زیادتی والی بات ٹھیک ہے مگر مولانا بلا وجہ جھک جھک کیا کرتے تھے۔ خواہ مخواہ غصّہ آتا تھا۔ سبھی کو جاہل سمجھتے تھے۔ یہی تھی ان کا روزمرّہ تھا۔ چونکہ مولانا نے شاعری کا لچ کھولا ہوا تھا۔ جہاں شاعر بنائے جاتے تھے اور شاعری بکتی تھی۔ نرخ تھا تین روپے غزل، چار روپے غزل، مولانا کو چونکہ اپنا رعب گانٹھنا ہوتا تھا۔ اس لیے سب کی غلطیاں نکالا کرتے تھے۔ جیسے سب عقل کو دفن کرکے بیٹھے ہوں اور ایک یہی علامۂ دہر ہوں۔

لو! ایک قصّہ اور سُنیے، پھر تم کچھ فیصلہ کر سکو گے!

اسی طرح یہ مولانا ظفر علی خان کے دفتر پہنچ گئے۔ علمی باتیں شروع ہوئیں مگر نوبت تُو تکار تک پہنچ گئی۔ اظہر صاحب ایک دم گرم ہو جانے کے مرض میں مبتلا تھے۔ پہل خود کرتے تھے۔ مخاطب کو غصّہ آ ہی جایا کرتا تھا۔ غرض اظہر صاحب کی مولانا ظفر علی خاں سے بات اس حد تک بڑھی کہ ظفر علی خاں نے مولانا اظہر کے ایک تھپڑ جڑ دیا۔

اظہر صاحب وہاں سے یہ کہتے ہوئے اُٹھے۔ "اب ملاقات تھانے میں ہو گی۔"

مولانا اظہر چلے گئے تو ظفر علی خان کو خیال آیا کہ کہیں واقعی مولانا اظہر تھانے نہ پہنچ جائیں۔ وقتی غصّہ، مسئلہ نہ بن جائے۔

وہ زمانہ خلافت کا تھا۔ ظفر علی خان کے پاس بے شمار والنٹیر تھے۔
انھوں نے دس بارہ والنٹیروں کو بلایا اور ان سے کہا کہ فلاں جگہ مولانا اظہر دہلوی
کا مکان ہے وہاں جاؤ اور ان کے مکان کا محاصرہ کر لو۔ تاکہ مولانا گھر سے نکلنے
نہ پائیں۔ چنانچہ والنٹیروں نے اظہر صاحب کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ کوئی چھ سات
دن تک یہ قصّہ چلا۔

ایک دن مولانا ظفر علی خان نے دیکھا کہ والنٹیر واپس چلے آ رہے
ہیں۔ مولانا نے وجہ پوچھی تو انھوں نے مولانا اظہر دہلوی کی تحریر دکھائی،
جس میں لکھا تھا۔ "میں وعدہ کرتا ہوں کہ تھانے نہ جاؤں گا"

ایک دن حکیم صاحب تشریف لائے۔ مَیں دفتر میں موجود نہ تھا۔ مایوس
ہو کر لوٹ گئے۔ دوسرے دن ملاقات ہُوئی تو پوچھا۔ "کل کہاں تھے؟"
مَیں نے عرض کیا۔ "پڑوسیوں کا جھگڑا تھا۔ انھوں نے میری گواہی لکھوا
دی تھی۔ اس لیے عدالت میں گواہی کے لیے گیا ہُوا تھا"

کہنے لگے۔ "مَیں نے بھی زندگی میں ایک دو گواہیاں دی تھیں۔ جو دلچسپ
تھیں" پھر گویا ہُوئے:

"مَیں ریلوے میں ملازم تھا۔ میرے پاس دو سکھ آئے۔ ایک کا نام گنڈا
تھا۔ دوسرے کا نام لدھا۔ انھوں نے کہا۔ کل کے لیے ویگنیں بُک کر دیجیے۔ ہم
مویشی لے کر آئیں گے"

میں نے کہا۔" ہانک لانا۔ ویگنیں مل جائیں گی۔"

مگر دوسرے دن ان میں سے کوئی نہ آیا۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ پندرہ بیس روز کے بعد لہنا آیا۔ میں نے کہا۔" گہنا کہاں ہے؟ اور یہ بھی پوچھا کہ تم لوگ پھر آسے ہی نہیں؟"

لہنا نے کہا۔" بابوجی! یاری کی چوری بن گئی۔"

"سمجھ میں نہیں آیا کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

لہنا نے بتایا کہ" دوسرے دن، پروگرام کے مطابق ہم ضرور حاضر ہوتے مال بھی بک کرانے مگر ہُوا یہ کہ گہنا پر چوری کا الزام لگا دیا گیا اور وہ پکڑ لیا گیا۔ قصّہ یہ تھا کہ گہنا پر ایک لڑکی عاشق تھی۔ اُن لوگوں کی اور تو کوئی پیش نہ گئی۔ انھوں نے گہنا کو چوری کے الزام میں گرفتار کرا دیا۔ یوں ہم لوگ نہ آسکے۔ معاملہ کچھ، بہانہ کچھ!

اب آپ سے غرض ہے کہ آپ ہماری گواہی دیں کہ ہم نے فلاں تاریخ کو مال کی بکنگ کرائی تھی۔ مگر ہم لوگ وقت پر حاضر نہیں ہو سکے۔"

گواہی سچی تھی۔ مَیں نے حامی بھر لی۔

عدالت میں پہنچا تو دیکھا کہ کمرہ سکھوں سے بھرا ہُوا ہے۔ دو ٹولیاں الگ الگ بیٹھی ہیں۔ اُن کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ مَیں نے ماحول دیکھا تو بے حد گھبرایا۔ مگر اُس وقت سوائے حوصلے سے کام لینے کے اور

کوئی چارۂ کار نہ تھا۔

میرا نام پکارا گیا۔ جو واقعہ تھا۔ میں نے عرض کر دیا۔ مخالف وکیل نے جرح کی۔ "آپ گھنا اور لہنا کو پہلے سے جانتے تھے؟"

"نہیں۔"

"پھر آپ کو ان کے نام کس طرح یاد رہ گئے؟"

"ان کے نام ہی ایسے تھے گھنا اور لہنا۔ جو شخص ان کے ناموں کو ایک بار سن لے گا۔ وہ عمر بھر بھول نہیں سکتا۔"

"اچھا تو پھر انھوں نے مال بک کرانے کے لیے آپ سے کہا؟"

"جی ہاں"!

"آپ کے پاس رجسٹر تو ہو گا۔ جس میں آرڈر بک کرتے ہیں؟"

"جی ہاں، رجسٹر ہوتا ہے مگر ہم رجسٹر کا استعمال اُس وقت کرتے ہیں جب بے حد رش ہوتا ہے۔ جن دنوں یہ دونوں آئے تھے۔ اُن دنوں کوئی رش نہ تھا۔ جو کوئی بھی مال لے کر آتا تھا۔ بک ہو جاتا تھا۔"

حکیم صاحب نے کہا۔ "مخالف وکیل نے مجھے پٹڑی سے اُتارنے کی بڑی کوشش کی مگر میں کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے مخالف وکیل کی ایک نہ چلنے دی۔"

اس کے بعد کہنے لگے۔ ایک اور گواہی بھی دی تھی۔ جو بے حد دلچسپ تھی، مگر میں وہ آپ کو پھر کبھی سناؤں گا۔ اس وقت تھک گیا ہوں۔ ہائے ہائے

مرگئے۔ حد ہوگئی گرمی کی بھی، معلوم ہوتا ہے جہنّم کے پٹ کھُل گئے ہیں۔"

مَیں نے سوچا۔ یہ بات اب رہ گئی تو پھر ذہن سے اُتر جائے گی۔ بڑی محبت سے پوچھا۔ "حکیم صاحب چائے پیجیے گا یا کوئی ٹھنڈی چیز؟"

"اس وقت کچھ نہیں۔ میری جان چھوڑ دو!"

"آپ کی جان چھوڑ دوں گا مگر یہ تو بتا دیجیے کہ کیا پئیں گے؟"

"اچھا تو پھر چائے منگواؤ، لوہے کو لوہا کاٹے۔"

چائے آ گئی، چسکی لی تو مَیں نے کہا۔ "حکیم صاحب معلوم نہیں کل تک ہم زندہ بھی رہیں گے یا نہیں اس لیے دلچسپ گواہی والی بات آج ہی بتا دیجیے۔"

"بڑے بدمعاش ہو۔"

"جی ہاں!"

"سنو، پنڈت ٹھاکر دت لاہور کا ایک مشہور حکیم تھا۔ اکثر دواؤں کے اشتہار دیا کرتا تھا۔ قوتِ مردمی کی دواؤں پر اس کے سارے کاروبار کا انحصار تھا۔ اس نے ایک اشتہار چھاپا حکومت نے اُسے فحش قرار دے کر مقدّمہ چلا دیا۔

وہ اشتہار کچھ ایسا تھا:۔

" دو گھنٹے قبل..... جب خواہش..... ہوتا ہے

وغیرہ وغیرہ!"

یہ ثابت کرنے کے لیے کہ یہ اشتہار فحش نہیں ہے۔ پانچ بڑے نامور حکیم گواہی دینے کے لیے عدالت میں حاضر تھے۔ اُن میں شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی، شفاء الملک محمد حسن قرشی، حکیم ظفر یاب، ڈاکٹر مرزا امام الدین اور پانچواں یہ خاکسار!

اشتہار فحاشی کی ذیل میں آتا تھا مگر ہمارے وکیل نے سبھی گواہوں سے یہ کہا تھا کہ گواہی میں یہ کہنا ہے کہ پنڈت ٹھاکر دت کی مشہور دوا "حبِ نشاط" مردانہ کمزوریوں کا شافی علاج ہے۔ اس کے استعمال سے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس لیے پبلک کی بہبود کے لیے اشتہار دیا گیا۔ جہاں فحش الفاظ لکھنے کا امکان ہو سکتا تھا۔ وہاں حکیم صاحب نے ڈیش لگا دیے ہیں، تاکہ اعتراض کا محل نہ رہے۔ وغیرہ وغیرہ!

حکیم صاحب نے کہا۔ "اتفاق کی بات کہ سب سے پہلے مجھے گواہی کے لیے طلب کیا گیا۔"

"آپ کے سامنے جو اشتہار ہے، کیا یہ فحش نہیں ہے؟ سرکاری وکیل نے کہا۔

معاً مجھے احساس ہُوا کہ جو باتیں ہمارے وکیل نے بتائی ہیں۔ اگر میں نے وہ کہہ دیں تو پنڈت جی قانون کی زد سے بچ نہ سکیں گے۔ لہذا میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "اس میں ایک لفظ بھی فحش نہیں۔"

"دو گھنٹے قبل کس طرف اشارہ ہے؟"

"حبِ نشاط دوا کی طرف!"

حسبِ خواہش سے کیا مطلب ہے ؟"

"فائدہ سے۔"

"جو تاویل آپ کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب وہ بالکل نہیں۔ بلکہ اشتہار بالکل واضح ہے اور فحش ہے۔ (پھر ذرا رُک کر) بھلا یہ اشتہار خصوصی طور پر کس مقصد کے لیے ہے ؟"

"جو دوا مردانہ بیماریوں کے لیے مفید ہوتی ہے وہ عموماً دیگر امراض کے لیے بھی مفید ہوتی ہے۔ مثلاً دل، دماغ، معدہ، جگر وغیرہ کے لیے۔ اور ان سارے ہی امراض کے نام اس اشتہار میں موجود ہیں (اور پھر زور دے کر) جب سارے نام اشتہار میں درج ہیں تو مَیں حیران ہوں کہ ہمارے مخالف وکیل ایک دو امراض کے ناموں سے آگے کیوں نہیں بڑھتے ؟ کیا مَیں اس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں ؟"

"مَیں کیوں بڑھوں جب کہ بات واضح ہے۔"

"بے ادبی معاف، آپ نے اپنے ذہن میں اپنے مطلب کی بات کو جگہ دے رکھی ہے۔ دوسرے لفظوں میں مَیں یہ کہہ سکتا ہوں کہ آپ کے سوچنے کا رُخ غلط ہے۔ جو قطعی صحت مندانہ نہیں۔"

جب حکیم صاحب یہ سب کچھ بیان کر چکے تو انھوں نے آنکھوں میں چمک پیدا کر کے کہا۔ مَیں نے وہ بیان اس انداز سے دیا تھا کہ جج بھی متاثر

ہُوا۔ مخالف وکیل بھی گھبرا گیا۔ میرے بیان کے بعد جب مخالف وکیل نے کہا۔ "اور گواہ پیش کیجیے۔" تو ہمارا وکیل میرے بیان سے اتنا مطمئن ہو گیا تھا کہ اُس نے کہہ دیا تھا۔ ہم کوئی اور گواہ پیش نہ کریں گے۔" ہماری یہی ایک گُٹا ہی کافی ہے" نتیجہ یہ نکلا کہ پنڈت ٹھاکر دت مقدمہ جیت گیا۔

یہ واقعہ جس کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے۔ کچھ شک ضرور ہے۔ جی بھی یہ چاہتا تھا کہ اسے گول کر جاؤں۔ اگر یوں کرتا تو ممکن ہے میری قلمی شرافت پر حرف نہ آتا۔ مگر یہ ضرور ہوتا کہ میں حکیم صاحب کی شخصیت کے ایک رُخ کو واضح نہ کر سکتا۔ مجبوریاں بھی بعض اوقات اُنگلیاں اُٹھوا دیتی ہیں۔

حکیم صاحب ایک نامور رسالے کے ایڈیٹر ہی نہیں، نامور حکیم بھی ہیں انھیں دکانداری نہیں آتی۔ اس لیے مطلب میں بھیڑ نہ لگا سکے۔ دیانت داری سے علاج کرتے ہیں۔ نہ کھال اُدھیڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نہ مریضوں کو لٹکانے کی۔ غریبوں سے حتیٰ المقدور رعایت کرتے ہیں۔ امیروں سے "ٹکا"[1] کے پیسے لیتے ہیں مگر کھال پھر بھی سلامت رہنے دیتے ہیں۔

میں ان کی حکیمانہ سوجھ بوجھ کا بڑا قائل ہوں۔ اگر میں ان سے پوچھوں گا کہ آپ نے کون کون سے معرکے کے علاج کیے تو ایران توران کی بہت

---

[1] یہ لفظ پنجابی کا ہے۔ اُردو میں مجھے اس سے بہتر لفظ نہیں ملا۔

سنا میں گے مگر ہیں ایران توران کی سنوں کیوں؟ اپنے چشم دید حالات کیوں نہ کہوں!

ایک دن ہمارے رسالے کے خوش نویس، دانتوں کے درد سے بے حال بیٹھے تھے۔ درد اتنا شدید تھا کہ انھوں نے ٹھوڑی کے نیچے سے لے جاکر، سر پہ کس کے رومال باندھا ہوا تھا۔ اس پر بھی ہائے وائے کر رہے تھے۔ اتنے میں حکیم صاحب آگئے۔ "پوچھا کیا تکلیف ہے؟"

"دانتوں میں بے انتہا درد ہے۔ بُری طرح ہل رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے۔ سارے دانت نکلوا دو۔"

"ایسا ظلم نہ کرنا۔ یہ ایک پُڑیا کھا لو۔ درد غائب ہو جائے گا — ہلنے والے دانت ہتھوڑی سے بھی ہلاؤ گے تو نہیں ہلیں گے۔"

چنانچہ صاحب ایسا ہی ہوا۔ چند گھنٹوں میں درد غائب، دانت بھی پختہ!

ان کے اس نوع کے ایک ہزار قصے سنائے جا سکتے ہیں۔ مگر ہمیں ان کے اس رُخ کو زیادہ اُجاگر نہیں کرنا ہے۔ تاکہ یہ سوال نہ اُٹھے کہ یہ حکیم زیادہ بڑے ہیں یا مدیر!

حکیم صاحب پنڈی سے لاہور پہنچے۔ ہمارے دفتر تشریف لائے۔ میں موجود نہ تھا۔ پوچھا تو انھیں معلوم ہوا کہ کل سے طبیعت خراب ہے۔

اس لیے آج دفتر نہیں آسکے۔ چنانچہ حکیم صاحب گھر پہنچے۔

جب حکیم صاحب سیڑھیاں چڑھ رہے تھے تو ایک صاحبہ سیڑھیاں اُتر رہی تھیں۔ میرے پاس پہنچے تو پوچھا "کیا تکلیف ہے؟"

"دل گھبراتا ہے"

"یہ ٹھیک نہیں ہو سکتا"

مَیں نے پریشان ہو کر پوچھا "کیوں؟"

"جب ایسی ایسی لڑکیوں سے تمہارا ملنا جلنا رہے گا۔ تو دل ٹھیک رہ ہی نہیں سکتا"

"حکیم صاحب وہ تو میری ——"

"مَیں خوب سمجھتا ہوں"

سفر میں ایک دوسرے کی اچھائیوں اور برائیوں کا حال خوب کھلتا ہے۔ ایک بار اور دوستوں کے ساتھ حکیم صاحب بھی میرے ہم سفر تھے یا یہ کہ مَیں ان کا ہم سفر تھا اور ہمارے پاؤں کے نیچے زمین تھی مشرقی پاکستان کی!

سفر میں، حکیم صاحب اتنے اچھے ساتھی ثابت ہوئے کہ لطف آ گیا۔ جب ساتھیوں میں سے کوئی منہ بسورے الگ پڑا ہوتا تو حکیم صاحب اپنے تجربات و مشاہدات کے ایسے ایسے واقعات سنانے شروع کر دیتے کہ

لطف آجاتا۔ وقتی بدمزگی کے سارے آثار اُڑن چھو ہو جاتے۔ سب قریب قریب ہو کر بیٹھ جاتے۔

اس سفر ہی کے دوران ہمیں یہ بھی معلوم ہُوا کہ حکیم صاحب اپنے زمانے میں قیامت تھے۔ جوانی کی کھٹک سے لے کر، جوانی کی ٹنک ٹنک دزا نہ چلے۔ عورت کی نفسیات اور اس سے لطف اندوز ہونے کے ایسے راز اور ایسے واقعات سنائے کہ مولانا رازق الخیری ایسے ادھیڑ بھی جوان ہو اُٹھے ویسے بھرم رکھنے کو مولانا ساتھ ساتھ لاحول و لاقوۃ بھی پڑھتے جاتے تھے۔ مگر واقعاتِ گرم سُن رہے تھے پوری دلچسپی کے ساتھ، بلکہ ایک حد تک خضوع و خشوع کے ساتھ! سر ہلا ہلا کر اور ہر "ٹیپ کے مصرع" پر لاحول و لاقوۃ!

بے تکلف دوستوں اور بے تکلف سہیلیوں کی محفلیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔ خدا ان سے "نہ" بچائے۔ کیونکہ یہ بناوٹ کے پردے چاک کر دیتی ہیں اور ستھرے ستھرے آدمی کو سامنے لے آتی ہیں۔

پھر گناہ، سارے گناہ نہیں ہوتے۔ کچھ معصوم گناہ بھی ہوتے ہیں۔ جن پر فطرت کو بھی پیار آسکتا ہے اور پھر تھکی ہُوئی زندگی میں بجھی ہُوئی دھنک کی کروٹ جرم ہے تو کیوں؟ یہ میں کس سے پوچھوں؟

مولانا رازق الخیری کی طرح، مجھے بھی یہاں لاحول و لاقوۃ پڑھ لینا چاہیے اس کے بعد کہنا چاہیے جوانی سب کی دیوانی ہوتی ہے۔ مگر ان کی

جوانی کچھ زیادہ ہی دیوانی تھی۔ یہ بڑے کھرے آدمی ہیں۔ تقدس کا لبادہ اوڑھ کے انھیں بزرگ بننا نہیں آتا۔ بلکہ صاف گوئی اور بے باکی ان کی کمزوریاں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قریبی دوستوں کو، ان کا کچّا چھٹّا بھی معلوم ہے مگر میں کیا کروں؟ کیسے وہ باتیں لکھوں؟ جنھیں اصولاً مجھے لکھنا نہیں چاہیئے۔ اگر لکھنا نہیں چاہیے تو نظرانداز بھی نہیں کرنا چاہیے۔ بعض نستعلیق قسم کے بزرگ مجھ سے یہ چاہتے ہیں کہ میں زندگی کے اس باب کو گول ہی کر جایا کروں مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ شخصیت نگاری میرے نزدیک اُس مکمّل چہرے کی مانند ہے۔ جس کے کان، ناک، منہ اور آنکھیں ہوتی ہیں۔ اگر میں کسی شخصیّت کا کوئی پہلو چھپاتا ہوں تو میرے نزدیک اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے اس شخصیت کی ناک کاٹ ڈالی۔ یا اس کے کان کاٹ ڈالے۔

میں یہاں سچ کی زد میں آگیا ہوں۔ مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اب یہاں کیا کروں؟ کدھر جاؤں؟

سوچتے سوچتے ذہن ابوالکلام کے تذکرے کی طرف جانکلا۔ دیکھیے مولانا نے اپنی جوانی کے بارے میں کیا خوب لکھا :۔

"ہاں یہ ضرور ہے کہ اگر کسی کو اوّل روز سے اپنے زہد و پاکی کی خشک دامنی پر ناز ہو تو ہم کو بھی اپنی اس رندی و ہوسناکی کی تردامنی

کا کوئی شکوہ نہیں۔ جس کو عین اکیس بائیس کی عمر میں (کہ جنونِ شباب کی سرمستیوں کا اصلی موسم ہوتا ہے) دونوں ہاتھوں سے اس طرح نچوڑا کہ ایک قطرہ بھی باقی نہ چھوڑا۔ کوئی صاف راہ پر دوڑتا گیا ہے تو یہ اس کی خوش نصیبی سہی لیکن ہم بھی اس کو بدنصیبی نہیں سمجھ سکتے کہ کتنی ہی دلدلوں سے پاؤں نکالے کتنی ہی جھاڑیوں سے دامن سنبھالا، کتنی ہی زنجیریں توڑنی پڑیں۔ ولولوں امنگوں، امیدوں، تمناؤں کے کتنے ہی دفتر خود اپنے ہاتھوں جلانے پڑے۔ جب کہیں جا کر اس کوچے میں دم لے سکے۔ جہاں آج اپنے آپ کو پا رہے ہیں ؎

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے"

حکیم صاحب ابوالکلام نہیں ہیں۔ نہ ہی میرے قلم میں اتنا بوتا ہے کہ میں تلمیحات اور استعاروں میں واقعات کو ڈبو سکوں۔ اس لیے سوئی ہوئی راتوں کو کون جگائے؟

میں لکھنے کو تو یہاں سب کچھ لکھ دوں۔ مگر ڈر ہے تو یہ کہ یہ ذکرِ جمیل طول بہت کھینچے گا۔ کم از کم بھی سو پچاس صفحات، ممکن ہے کہ آپ اس کے لیے بھی تیار ہو جائیں مگر میں اس کے لیے تیار نہیں۔ کھنکتی باتیں صاحب تذکرہ ہی سے بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ اہلِ حیا" کے لیے واجب ہے کہ وہ

اس ضمن میں، اگر اشاروں سے کام چلا سکیں تو دریغ نہ کریں۔ اس لیے یہاں میں بھی صرف اتنا ہی عرض کروں گا کہ ابوالکلام کی جوانی کو، حکیم صاحب کی جوانی کا دیباچہ سمجھیں۔

نیرنگِ خیال نے کھان کے کھان ادیب بنا ڈالے۔ اس میدان میں بھی ان کا کوئی حریف نہیں۔ یہاں صرف ایک مثال دوں گا۔ صرف ایک مثال!

غلام عباس جو اُردو کے بہت بڑے افسانہ نگار ہیں۔ آٹھویں جماعت پاس کر کے، نیرنگِ خیال کے دفتر میں آنے جانے لگے تھے۔ حکیم صاحب نے دیکھا کہ لڑکا محنتی ہے۔ اس لیے اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔" لہٰذا "ہم غلام عباس کی تحریروں کی تراش خراش میں لگ گئے۔ چیتک کوئی بھی ہو۔ خراج ضرور وصول کرتی ہے۔"

اُن دنوں ادب پاروں کا رواج تھا۔ سبھی انگریزی کے اچھے اچھے ادب پاروں کو اُردو میں منتقل کرنے کو ہی بڑا اعزاز سمجھتے تھے۔

بقول حکیم صاحب، غلام عباس اس وقت انگریزی میں معمولی شُد بُد رکھتے تھے۔ بعد میں چھوٹے موٹے امتحان دیے ہوں تو دیے ہوں مگر اُن دنوں آٹھویں جماعت ہی کے طالب علم تھے۔

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ اُن دنوں میں نے جب بھی انھیں کسی ادب پارے کے ترجمے کے لیے کہا تو انھوں نے ڈکشنری سامنے رکھ لی۔ پہلے تمام

مشکل الفاظ کے معنی لکھ لیے۔ پھر ایک جملے کے ترجمے کی کوشش کی۔ اس طرح ایک ایک جملے کو کئی کئی طرح سے لکھا۔ یوں وہ ایک چھوٹے سے ادب پارے کو ہفتوں میں ترجمہ کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ ہم میں سے کسی کو دکھاتے تھے۔ اس پر اصلاح ہوتی تھی، تب وہ کہیں جا کر چھپتا تھا۔

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ ہم لوگ اتنی ریاضت ایک ادیب کو بنانے اور سنوارنے میں صرف کیا کرتے تھے۔ جب یہ واقعہ حکیم صاحب بیان کر چکے تو ان کا چہرہ دمک رہا تھا۔ چنانچہ انھوں نے تان یہاں پہ توڑی۔ "آج اسی محنت کا نتیجہ ہے کہ غلام عباس کو صدرِ مملکت نے اپنی کتاب کے ترجمے کے لیے چُنا۔ حالانکہ اس ملک میں ایک سے ایک پڑھا لکھا پڑا ہے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی پڑے ہیں۔"

تھوڑی دیر رُک کر حکیم صاحب پھر گویا ہوئے۔ "میں صرف زبانی حوصلہ افزائی نہیں کیا کرتا تھا۔ بلکہ روپے پیسے سے بھی دل بڑھایا کرتا تھا۔ چنانچہ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نے بیس روپے غلام عباس کی والدہ کو جا کر دیے تھے اور یہ کہا تھا کہ یہ غلام عباس کے ایک مضمون کا انعام ہے۔ اس وقت میرے ساتھ تاثیر مرحوم بھی تھے۔"

یہ جوہر شناس تو تھے، انھوں نے جب عبدالرحمٰن چغتائی کی تصویروں میں ندرت دیکھی۔ فن پایا تو انھوں نے سوچا، چغتائی صاحب کی حوصلہ افزائی

ہونی چاہیے۔ تشہیر کرنی چاہیے۔ تاکہ وہ آیندہ کار ہائے نمایاں انجام دے سکیں۔ چنانچہ انھوں نے چغتائی صاحب کی نہ صرف تصویریں چھاپیں بلکہ اُن کے فن پر مضامین بھی چھاپے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب چغتائی صاحب کے فن کی زیادہ دھوم نہ تھی۔ بلکہ بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو ان کی تصویروں کے خلاف تھے۔ وہ کہتے تھے یہ تصویریں کیا ہیں؟ کچھ بھی نہیں!

جب نیرنگِ خیال میں مسلسل مضمون نکلنے لگے۔ تصویریں چھپنے لگیں تو اُس وقت کے ایک رسالہ "الکمال" کے ایڈیٹر نازش رضوی نے چغتائی صاحب کی تصویروں کے خلاف اپنے پرچے میں مضمون چھاپا۔ جس میں یہ لکھا کہ چغتائی کو مصور کون کہتا ہے؟ تصویر کی تعریف یہ ہے کہ انسان اُسے دیکھ کر مبہوت ہو جائے۔ چغتائی کی تصویریں صرف بچّوں کو ڈرانے کے کام آسکتی ہیں آنکھیں ایسی جیسے بٹن، اُنگلیاں ایسی جیسے بھنڈیاں چہرہ ایسا جیسے طباق!

جب "الکمال" میں ایسا مضمون نکلا تو حکیم صاحب کو فکر ہوئی۔ انھوں نے سوچا کہ بجائے اس کے کہ "الکمال" کے مضمون کا جواب لکھا جائے۔ بہتر یہ ہے کہ مضمون نگار سے ملا جائے۔

نازش صاحب نے مجھے بتایا:۔

حکیم صاحب مجھے ڈھونڈھتے ڈھانڈھتے آئے۔ فرمایا "یہ آپ نے

چغتائی کے خلاف کیا لکھ دیا؟"

"جو محسوس کیا۔ وہ لکھا۔"

"آپ جس انداز کی مصوری کے دلدادہ ہیں۔ وہ مصوری نہیں فوٹوگرافی ہے۔"

"میں تو مصوری کے بارے میں یہ جانتا ہوں کہ مصوری ایک ایسی شراب ہے، جو آنکھوں کے رستے پی جاتی ہے۔"

"جس طرح شاعر نئے اندازِ فکر کو اپناتا ہے کہ اس کی انفرادیت ظاہر ہو۔ اُسی طرح اس مصوّر نے اپنی تصویروں میں لکیر کا فقیر بننے کی بجائے اپنا الگ راستہ تلاش کیا ہے۔"

"نیاپن وہی بھلا جو ناگوارِ خاطر نہ ہو۔"

"مجھے بڑی حیرت ہے کہ آپ کو ان تصویروں میں کوئی حسن نظر نہیں آتا۔"

"جی ہاں میرا یہی خیال ہے۔"

نازش صاحب کہتے ہیں کہ اس گفتگو کے بعد حکیم صاحب چلے گئے۔ دو تین مہینوں کے بعد پھر ملے تو کہنے لگے۔ نازش صاحب مجھے ایک اسسٹنٹ کی ضرورت ہے۔ کیا آپ ہمارے ہاں آسکیں گے؟"

"میں تو ایک جگہ کام کر رہا ہوں۔"

"وہاں سے چھوڑ دیجیے۔ میں آپ کو دس روپے زیادہ دوں گا۔"

"چنانچہ میں نے وہاں سے کام چھوڑ دیا۔ نیرنگِ خیال میں آگیا۔ میرا خیال یہ تھا کہ نیرنگِ خیال میں جاؤں گا تو ادبی ذوق کو تسکین ملے گی۔ میرے مضمون چھپیں گے مگر مجھے حکیم صاحب نے کبھی بھی کسی چیز کے دینے کے لیے نہ کہا۔ میں حیران تھا۔ ایک دن پوچھ ہی لیا:۔

جناب میں بھی مضمون لکھ سکتا ہوں۔ ایک سال ہو گیا ہے۔ آپ نے مجھ سے سوائے پروف ریڈنگ کے کبھی کچھ کہا ہی نہیں۔ آخر کیوں؟"

"ہمیں ضرورت نہیں۔"

"پھر مجھے بلایا کیوں تھا؟"

"صرف اس لیے کہ تم چغتائی کے خلاف نہ لکھ سکو۔"

نازش صاحب کہتے ہیں۔" اُس وقت تو مجھے بڑا غصہ آیا۔ پی گیا۔ خاموش رہا۔ آج جب مجھے وہ بات یاد آتی ہے، تو حکیم صاحب پر بڑا پیار آتا ہے۔ صرف اس بات کی خاطر کہ میں چغتائی صاحب کے بارے میں کچھ نہ لکھوں۔ انھوں نے مجھے اپنے ہاں نوکر رکھ لیا تھا۔"

واقعی کسی فن کار کے ساتھ اس حد تک مخلص ہونا حکیم صاحب ہی کا حصہ ہے۔ بے شک چغتائی اپنی صلاحیتوں ہی سے آگے بڑھے۔ اگر چغتائی کے فن میں جان نہ ہوتی تو حکیم صاحب کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مگر فن کی

پرکھ، پھر فن کار سے اس حد تک محبت انہی کا حصّہ ہے۔

مجھے یہاں ڈاکٹر اقبال کا وہ واقعہ یاد آگیا کہ جب علامہ اقبال نے (ابتدا ہی میں) شاعری ترکؔ کر دینے کا فیصلہ کرلیا تھا تو سر عبد القادر نے کہا تھا۔ "اقبال ایسا ظلم نہ کرنا، تمہاری شاعری کی مسلمانوں کو ضرورت ہے۔"

اگر اس وقت سر عبد القادر بھی اقبال کی ہاں میں ہاں ملا دیتے تو آج علامہ اقبال کے نام سے، شاید ہم واقف ہی نہ ہوتے بالکل اُسی طرح اگر الکمال کے ایڈیٹر کی طرح کے لوگ چغتائی صاحب کے پیچھے پڑ جاتے اور انھیں کوئی حکیم یوسف حسن نہ ملتا تو ہو سکتا تھا کہ چغتائی صاحب بھی بد دل ہو کر اپنا راستہ بدل لیتے۔

حکیم صاحب نے بتایا کہ پہلے پہل عظیم بیگ چغتائی کی "شریر بیوی" قسط وار نیرنگِ خیال میں چھپی تھی۔ اس سے پہلے عظیم بیگ کو زیادہ لوگ نہیں جانتے تھے یا یہ کہ زیادہ شہرت نہ تھی۔

شریر بیوی کی دو چار قسطیں چھپی ہوں گی کہ دھوم مچ گئی۔ خود چغتائی صاحب نے مجھے لکھا کہ "میں اس سے پہلے ہندوستان کے کئی پرچوں میں لکھتا تھا۔ مجھے کسی نے نہ جانا۔ میں نے نیرنگِ خیال میں لکھا

لے اقبال ہی کا یہ شعر ہے ؎

توبہ کرلی ہے شعر گوئی سے ۔۔۔ اس کی قیمت پڑی نہ اک پائی

تو سب نے جان لیا۔"

شریر بیوی کی اشاعت سے پہلے حال یہ تھا کہ عظیم بیگ چغتائی کے مضامین عدمِ اشاعت کی بنا پر واپس بھی آجایا کرتے تھے۔ جن پر مدیران کرام کے ریمارکس ہوتے تھے کہ "معیار کے مطابق نہیں"۔ یوں تیرہ مضامین واپس آچکے تھے۔ یہ واقعہ جب عظیم بیگ نے حکیم صاحب کو بتایا تو حکیم صاحب نے لکھا۔"وہ سارے مضامین مجھے بھیج دیں۔"

مضمون آگئے تو انھوں نے انھیں پڑھا۔ تین مضامین نیرنگِ خیال کے لیے رکھ لیے۔ باقی دس مضمونوں کے بارے میں چغتائی صاحب کو لکھ دیا کہ فلاں فلاں رسالے کو بھیج دیجیے۔ چھپ جائیں گے۔ انھوں نے مضامین کے معیار اور رسائل کے مدیران کے رجحان کو سامنے رکھتے ہوئے وہ رائے قائم کی تھی۔ ان کی ریڈنگ صحیح نکلی اور وہ سارے ہی مضامین مختلف رسالوں میں چھپ گئے۔ چغتائی صاحب بڑے حیران ہوئے۔ انھوں نے انھیں لکھا۔"صاحب مان گیا۔"

انھوں نے یہ بھی بتایا۔"شوکت تھانوی بھی اِدھر اُدھر لکھا کرتے تھے۔ شگفتہ نگار کی حیثیت سے پڑھے ضرور جاتے تھے، مگر جو شہرت انھیں نیرنگِ خیال نے دی۔ وہ انھیں کسی اور طرح نہ مل سکتی۔"

"وہ کیسے ؟"

کہنے لگے، "لوگوں نے شوکت تھانوی کو سودیشی ریل کی وجہ سے پہچانا۔ وہ پہلے پہل نیرنگِ خیال میں چھپا تھا اور میں نے شوکت صاحب سے مضمون کی اشاعت سے پہلے ہی یہ کہہ دیا تھا کہ اس مضمون کی اشاعت سے آپ آسمان پر پہنچ جائیں گے۔ چنانچہ میرا اندازہ صحیح نکلا۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا وہ مضمون آپ نے لکھوایا تھا۔ جو آپ اتنا اینٹھ رہے ہیں؟"

"ہاں! میں لکھنؤ گیا تھا۔ شوکت سے مضمون لکھنے کو کہا۔ انہوں نے مجھے دو تین پلاٹ سنائے' رائے پوچھی۔ "کس موضوع پر لکھوں؟" میں نے سودیشی ریل کے موضوع کو پسند کیا تھا۔ پھر دُھن کی لی۔ اگر کوئی ایڈیٹر یہ اندازہ نہیں کر سکتا کہ ہمیں کس قسم کے مضمونوں کی ضرورت ہے تو وہ ایڈیٹر بننے کے قابل نہیں۔ ایڈیٹر کا کام یہ ہے کہ وہ باصلاحیت لکھنے والوں کو تحت الثریٰ سے اُٹھائیں اور آسمان پر پہنچا دیں۔"

حکیم صاحب نے بتایا کہ جب میرے پرچے کو بے اندازہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ تو ساتھیوں نے سوچا کہ پرچہ تو ہماری وجہ سے اس مقام پر پہنچا ہے اور حکیم یوسف حسن ہے کہ ہمیں لفٹ ہی نہیں دیتا۔ کیوں نہ اس کا مزاج درست کر دیا جائے۔

"چنانچہ میرا مزاج درست کرنے کے لیے انھوں نے "کارواں" نکالا۔

چغتائی صاحب کو رگا نٹھا۔ مجید ملک اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ مددگاروں میں تاثیر، پطرس، غلام عباس، قاضی عبدالغفار، سبھی نے ادارۂ "کاروان" کا ساتھ دیا۔ پرچہ بے شک اچھا نکلا۔ مگر انجام کیا ہوا۔ صرف دو پرچے نکلے۔ جذبہ غلط تھا۔ پروان کیسے چڑھتا۔

جب "کاروان" کے لیے ابتدائی کوششیں جاری تھیں تو انہی دنوں مجھ سے کہلوایا گیا تھا کہ حکیم صاحب اب اپنی خیر منائیں۔ اِدھر "کارواں" نکلے گا اُدھر "نیرنگِ خیال" راستے سے ہٹ جائے گا۔

پھر انھوں نے بتایا کہ ایک ایسا ہی بھرپور وار تاجور نجیب آبادی نے بھی کیا تھا۔ انھوں نے "شاہکار" نکالا۔ بڑے ٹھاٹھ سے! تاجور کے پاس اُس وقت کوئی تیس چالیس ہزار روپیہ تھا۔ انھوں نے بہت بڑا اسٹاف رکھا۔ ڈھائی سو روپیہ ماہوار کرایے پر دفتر لیا۔ مضمون نگاروں کو معقول رقم معاوضے میں دینے کا اعلان کیا۔ یہ زمانہ ۱۹۳۲-۳۳ء کا ہوگا۔ سبھی مضمون نگار اُدھر "ڈھل" (اُردو میں "ریجھ" کا لفظ، قدر سے ہم معنی ہے) پڑے۔ پہلا پرچہ جو نکلا تو دھوم مچ گئی۔ نیرنگِ خیال سے سائز دوگنا، کاغذ سفید، ٹائیٹل نورنگ کا مضمون نگار اچھے، ایں دم بخود رہ گیا۔ قیمت بھی لاگت اور دیگر اخراجات کے مقابلے میں کم رکھی۔ ہر طرف شاہکار ہی شاہکار کی دھوم، یہی وجہ تھی کہ تاجور صاحب آپے میں نہ رہے۔ جب میرے ایک دوست تاجور صاحب کی خدمت میں

حاضر ہوئے تو انھوں نے شاہکار کی تعریف کی۔ تعریف کے قابل جو تھا۔ میرے اُس دوست نے بتایا کہ میرے تعریفی کلمات کہنے پر تاجور صاحب کرسی سے اُٹھے۔ سیدھے کھڑے ہو کر جھکے اور اپنی انگشت کھڑی کر کے، زمین سے آسمان کی طرف کر کے اُٹھتے ہوئے، بڑے ایکٹرانہ انداز میں پورے زور سے کہا۔ "مٹا دوں گا!"

پرچہ دیکھا تھا۔ ایسی باتیں سُنیں۔ گھبرانے والی بات تھی، مگر میں بالکل نہ گھبرایا۔ میں نے اندازہ کر لیا کہ اس ٹھاٹھ کا پرچہ سدا نہیں نکل سکتا۔ زیادہ سے زیادہ اس طرح کا پرچہ اور اتنے سرمائے سے ایک سال تک نکالا جا سکتا ہے میں نے فیصلہ کر لیا۔ مجھے اس پرچے کا مقابلہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ پرچہ اپنی موت آپ مر جائے گا۔ چنانچہ میں نے اپنے پرچے کو بجائے بہتر بنانے کے اُسے ترقیٔ معکوس کی طرف لڑھکایا۔ سائز چھوٹا کر دیا۔ صفحات کم کر دیے۔ ایک سال تک شاہکار خوب چڑھا۔ میرا پرچہ ڈبّو رہا۔ اُدھر واہ واہ، اِدھر ہے ہے!

میرے دوستوں نے کہا۔ "یہ کیا کر رہے ہو۔ لٹیا ڈبو دی۔"

میں نے کہا۔ "چپ رہو۔"

میں نے ان دنوں اپنا نعرہ "ری ٹریٹ" (Retreat) یعنی پیچھے ہٹ جاؤ۔ بنا لیا۔

میرے خیر خواہ پوچھتے۔ "پرچے کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں؟"

میں کہتا۔ "ری ٹریٹ"۔

جب میں نے اندازہ لگا لیا کہ تاجور صاحب کا مال ختم ہو گیا ہے تو میں اپنے پروگرام کے مطابق مستعد ہو گیا۔ ایک دم بڑا سائز کر دیا۔ محنت کی۔ روپیہ خرچ کیا اور ایک ہی ہلے میں شاہکار کو چاروں شانے چت گرا دیا۔ اس کے بعد شاہکار پنپ نہ سکا اور نیرنگِ خیال نے پھر اپنا وہی سابقہ مقام حاصل کر لیا۔ پھر زندگی میں تاجور صاحب کی زبان سے کسی نے یہ نہ سنا "مٹا دوں گا"! بالآخر انجام یہ ہوا کہ جس پرچے پر چالیس ہزار لگائے گئے تھے۔ اسے چار سو میں بیچ کر گھر بیٹھنا پڑا۔ آغاز وہ، انجام یہ!

کہتے ہیں کہ نیرنگِ خیال کے عروج کے زمانے میں اتنے منی آرڈر آتے تھے۔ اتنے وی۔ پی آتے تھے کہ گھنٹوں ہی فارموں پر دستخط کرتے گزر جایا کرتے تھے، اور ہاتھ دستخط کرتے کرتے تھک جایا کرتے تھے — غرض ہُن برستا تھا۔

جن دنوں کی یہ بات ہے اُن دنوں اور بھی کئی اچھے رسالے لاہور سے نکلا کرتے تھے۔ مثلاً عالمگیر، ہمایوں، شباب اُردو، ادبی دنیا، وغیرہ! عالمگیر نے بڑی کوشش کی کہ نیرنگِ خیال کو نیچا دکھایا جائے مگر ان کی آرزو کبھی پوری نہ ہوئی۔ گھٹیا قسم کی ادبی رقابتوں نے انھیں کچھ کر کے دکھانے پر مجبور کر رکھا تھا۔ ورنہ شاید یہ بھی ہمچو ما دیگرے نیست

کہہ کر لنگوٹ کھول دیتے۔

اتنے معرکوں کے ناخدا، ویسے آج بڑے افسوس کے ساتھ کہتے ہیں —— "اب جاکر ہار گیا ہوں۔ عمر نے ہرایا۔"

واقعی! بڑھاپا —— تمناؤں اور آرزوؤں کے درمیان ایک ناقابلِ عبور فاصلہ ہے۔

میرے علم میں یہ تھا کہ حکیم صاحب نے صرف ایک رسالہ نیرنگِ خیال ہی نکالا تھا۔ معلوم ہُوا کہ میری معلومات ناقص ہیں۔ وہ ایک رسالے کے نہیں، اکٹھے سات رسالوں کے مدیر رہے۔ نہ صرف مدیر رہے بلکہ مالک بھی، بیک وقت وہ دو تین تین پرچے ایڈٹ کیے۔ سبحان اللہ!

نام آپ بھی سُن لیں، نیرنگِ خیال، فاز یانہ، بائیسکوپ، لیلیٰ، کامیابی، اسرارِ حکمت اور مخزنِ حکمت۔ ان میں کوئی ادبی پرچہ تھا، کوئی طبّی، کوئی صنعتی اور کوئی فلمی، یہ ہر طرف مار کرتے تھے۔ عجیب دماغ پایا تھا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ہر فن مولا کہا جاتا ہے۔ جو اپنی راہیں خود کاٹتے ہیں۔

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل رسائل کے بھی ادارتی فرائض انجام دیتے رہے۔ جیسے الحکیم، دیش اوپکارک، حامیٔ صحت، مسیح الملک، تندرستی۔ ان کے علاوہ ہفتہ وار سیاسی اخبار الخلیل بجنور (یو۔پی) غرض اپنے شہر کے پرچوں کے علاوہ دوسرے پرچوں کے بھی ادارتی فرائض انجام دیتے

رہے۔ پالیسی مرتب کرتے رہے۔ نوٹ وغیرہ لکھتے رہے۔ پھر پندرہ سولہ کتابوں کے مصنف بھی ہیں، جن میں سے بعض کے کئی کئی ایڈیشن چھپے۔ یہ سب سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ حکیم صاحب کس بلا کے انسان ہیں۔ کتنی انرجی تھی۔ کیا لگن تھی۔ کیا جنون تھا۔ کیا عشق تھا۔

بیشتر ادیبوں اور شاعروں نے یہ بھی سوچ رکھا ہے کہ بے راہ روی، ہمارے فن کے لیے ضروری ہے۔ کیونکہ یوں نت نئے تجربے حاصل ہوتے ہیں۔ احساسات جوان ہوتے ہیں۔ ایسی سوچیں کچے ذہنوں کی پیداوار ہیں۔ جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ اچھا ادیب، اچھا آدمی بھی ہوتا ہے۔ جو اچھا ادیب اچھا آدمی نہیں۔ وہ اپنے آپ میں نامکمل ہے۔

انھوں نے ادیب بننے کے لیے نہ ہی نت نئے تجربے حاصل کیے اور نہ ہی احساسات کو جوان رکھنے کے لیے مصنوعی سہاروں کو اپنایا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں اخلاقی قدروں کی پامالی قطعاً نہیں۔ بلکہ حد درجہ توازن ہے۔ حد درجہ شائستگی ہے۔

اور ہاں یہ بھی تو سُنیں :۔

جن دنوں یہ لائل پور میں تھے۔ ریلوے میں گڈز کلرک عمر بھی ان کی کچھ زیادہ نہ تھی، یہی کوئی اکیس بائیس برس ہوگی۔ اُن دنوں یہ سکھوں کے ایک اخبار "خالصہ" میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر کام کرتے تھے۔ چونکہ سرکاری

ملازم تھے۔ اس لیے اخبار پر ان کا نام تو نہ آتا تھا مگر کام انھیں پوری ذمہ داری کے ساتھ کرنا پڑتا تھا۔ تنخواہ تھی پچاس روپے ماہوار، جو آج سے پچاس برس پہلے اچھی خاصی تنخواہ تھی۔

اس اخبار کے ایڈیٹر لال سنگھ ایم۔ اے تھے اور مالک ہرچرن سنگھ، دونوں سے حکیم صاحب کی اچھی یاری تھی ملازم اور مالک والا رشتہ نہ تھا۔ بلکہ خوب گھٹتی تھی۔

لال سنگھ کے بارے میں، حکیم صاحب کا خیال یہ ہے کہ وہ تھے بے شک ایم۔ اے مگر تھے سکھ، اس لیے اپنی سادگی کی بنا پر، جو جی میں آتا تھا۔ لکھ ڈالتے تھے۔ ایک سے ایک لطیفے ہوتے رہتے تھے۔

ہرچرن بڑے شریف آدمی تھے۔ بے حد ملنسار، منہ وہ میٹھے والے، مگر وہ کبھی کبھی ایسا لفظ بول دیتے تھے کہ ہنس ہنس کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔

مثلاً ایک واقعہ سنو:۔

جن دنوں میں، اخبار میں کام کرتا تھا۔ انہی دنوں پنجاب کے گورنر لائل پور کے دورے پر آئے۔ ان کا کوئی خاص سواگت نہ ہوا۔ یہی بات لال سنگھ ایم۔ اے کو لکھنا تھی۔ مگر لال سنگھ نے لکھا تو یہ کہ "گورنر صاحب لائل پور سے ایسے گزر گئے جیسے ایک چیڑاسی گزر جاتا ہے"۔

اس فقرے پر اخبار کی ضمانت ہو گئی۔ تب ہرچرن سنگھ نے مجھ سے کہا۔

یوسف صاحب آپ نے بھی نہ ٹوکا کہ لال سنگھ یہ نہ لکھو۔"

"میں کیسے ٹوکتا سردار جی؟"

"جیسے ٹوکا جاتا ہے۔"

"جی اُس طرح تو ٹوکا تھا مگر لال سنگھ جی نے جواب دیا تھا۔ چُپ رہو اس میں بڑا بھرلی ہے۔"

"ان کے بھرلی میں ہمارا پڑلی ہو گیا۔"

یہ تھے ان کی ادارت کے قصے، پھر ادبی مقابلوں میں شریک۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنا ہفت روزہ "توحید" نکالا تو اس میں اعلان یہ چھپا کہ اس سال جس کا سب سے اچھا مضمون ہو گا۔ اُسے ایک اشرفی انعام میں دی جائے گی۔ چنانچہ اُس سال اشرفی حکیم یوسف حسن کے حصے میں آئی۔ مضمون کا نام تھا۔ "فرانسیسی ڈیوک کا اکلوتا لاڈلا" یہ واقعہ نیرنگِ خیال کی اشاعت سے بھی پہلے کا ہے۔

جب مولانا عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر نے زمیندار سے علیٰحدہ ہو کر اپنا اخبار "انقلاب" نکالا تو انھوں نے شروع دنوں ہی میں عید نمبر کا بھی اعلان کیا تھا۔ اُن میں اور مضمون نگاروں کے ساتھ حکیم صاحب کے بھی نام کا اعلان تھا کہ وہ بھی مضمون لکھیں گے۔

ادھر خود حکیم صاحب نیرنگِ خیال کا عید نمبر چھاپ رہے تھے۔ بعد

معروفیت تھی۔ انقلاب کے لیے مضمون نہ لکھ سکے۔ یہی اطلاع دینے دفتر انقلاب پہنچے کہ میری معذرت قبول کرلی جائے۔

سالک صاحب نے کہا۔ "اگر آپ کے نام کا اعلان نہ کیا ہوتا تو بات ٹل سکتی تھی۔ موجودہ صورت میں معذرت قبول نہیں کی جائے گی بلکہ آپ اُس وقت تک دفتر انقلاب سے جا ہی نہیں سکتے۔ جب تک کہ مضمون لکھ کر نہ دے جائیں۔"

چنانچہ حکیم صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے، بغیر کتابوں کی مدد کے ایک مضمون لکھا "حربی سیاست" جس میں دنیا کے تمام ممالک کی حربی سیاست پر بحث کی تھی۔ موضوع ادق تھا۔ کتابیں بھی موجود نہ تھیں مگر اس مضمون کو سالک صاحب نے بھی پسند کیا اور قارئین انقلاب نے بھی' اس واقعہ کا ذکر خود سالک صاحب نے انقلاب کے اُس عید نمبر میں بھی کیا تھا۔ حاضر دماغی کی بھی حد ہوگئی۔ جادو وہ جو سر پہ چڑھ کر بولے۔

حکیم صاحب کہتے ہیں۔ "لوگ سمجھتے ہیں کہ پرچہ چھاپنا معمولی کام ہے۔ مضمون حاصل کرنا معمولی بات ہے۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ وزیر بن جانا آسان ہے مگر اچھا پرچہ چھاپنا اس سے زیادہ مشکل ہے۔"

حکیم صاحب مضمون حاصل کرنے کے لیے' پورے ہندوستان کا دورہ کیا کرتے تھے۔ ادیبوں سے ذاتی تعلقات بنایا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ہندوستان کا کونا کونا چھان مارا۔ مثلاً دلّی، لکھنؤ، حیدرآباد، بمبئی، کلکتہ،

رام پور، علی گڑھ، مدراس، غرض ہر جگہ پہنچے پھر خط و کتابت کا لامتناہی سلسلہ! کرب ہی کرب والا مسئلہ!

کہنے لگے کہ لاہور میں بیٹھے ہوئے بھی، لاہور سے کسی اچھے مضمون کا حاصل کرنا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے بتایا کہ میں نے ایک مضمون حاصل کرنے کے لیے سید امتیاز علی تاج کے ہاں اٹھائیس چکر لگائے تھے۔ تب جا کر ایک مضمون ملا تھا۔

نہ تو امتیاز علی تاج کو رحم آیا کہ حکیم صاحب اتنی بار آئے ہیں، نہ میں نے یہ سوچا کہ میں ایک اتنے بڑے رسالے کا ایڈیٹر ہوں، اس لیے کیوں اپنی جوتیاں گھساؤں۔ غرض جو مضمون جس طرح ملا اسے حاصل کیا۔ روپے اور وقت کے زیاں ہی کوئی ایڈیٹر پڑے گا۔ تو وہ اچھا پرچہ نہ چھاپ سکے گا۔ رسالہ کا تو مطالبہ ہی یہ ہے کہ دولت برباد کرو۔ وقت ضائع کرو۔ غرض رسالہ ایک ایسا راکشش ہے۔ جس کے حضور وقت بھی بھینٹ چڑھانا پڑتا ہے اور دولت بھی، جو جتنی زیادہ قربانی دے گا۔ راکشش اس سے اتنا ہی خوش ہوگا۔

حکیم صاحب نے بتایا کہ چچا چھکن نیرنگ خیال ہی میں مسلسل چھپتا رہا ہے اور وہ مضامین ایسی ہی تگ و دو کے بعد حاصل کر کے چھاپے گئے تھے۔ اگر میں ہمت ہار بیٹھتا تو بہت ممکن تھا کہ یہ کردار اردو ادب کے سامنے آہی نہ سکتا۔

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ ایسے مضامین لکھنے کا مشورہ مَیں نے ہی تاج صاحب کو دیا تھا۔ انگریزی کی کتاب[1] لا کر دی تھی۔ پھر مَیں نے اپنے رسالے میں ایک انگریزی رسالے سے نقل کر کے ایک تصویر چھاپی تھی۔ اُس میں چچا چھکن تصویر ٹانک رہے تھے۔ یہ وہ سارے عوامل تھے۔ جنھوں نے مل کر تاج صاحب سے ایسی شان دار چیز لکھوائی تھی۔

حکیم صاحب نے یہ بھی بتایا کہ مَیں چاہتا تھا کہ کوئی بڑا شاعر جنگ اور جہاد کے موضوع پر، ساری اسلامی لڑائیوں کو نظم کر دے۔ یہ خیال انھیں اس لیے پیدا ہُوا تھا کہ انھوں نے اپنے پرچے میں ایک نظم فتح قسطنطنیہ[2] چھاپی تھی، جو پسند کی گئی تھی۔

انھوں نے یہ بات کئی شاعروں سے کہی کہ اسلامی فتوحات پُرجوش اور ولولے سے مملو، جرّاری زبان میں نظمیں لکھی جائیں، تاکہ مسلمان سوتے سے بیدار ہوں۔ اپنی اس اسکیم کا ذکر ابو الاثر حفیظ جالندھری سے بھی کیا۔ انھوں نے اس پر سوچا، مزید سوچا۔ تب اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اسلامی تاریخ کو نظم کرنا چاہیے۔ اس طرح جنگ نامہ اسلام تو نہ چھپا مگر شاہنامہ اسلام چھپ گیا۔ یوں چِت بھی اپنی، پٹ بھی اپنی والی بات ہو گئی۔

---

[1] چچا چھکن کے دیباچہ میں خود امتیاز صاحب نے لکھا ہے۔ ماخوذ "جیروم کے جیروم"۔
[2] نظم نگار تھے سید طالب علی عابد الہ آبادی۔

میں بڑا حیران ہوں۔ لیلیٰ کے خطوط انھوں نے پیش کیے۔ اگر یہ ہمت نہ کرتے تو شاید چھپتے ہی نہیں۔ شریر بیوی انھوں نے لکھوائی اور چھاپی۔ سودیشی ریل کا سہرا بھی انہی کے سر بندھتا ہے۔ پطرس کے مضامین بھی نیرنگِ خیال میں چھپ کر بامِ عروج تک پہنچے۔ چچا چھکن کا بھی کریڈٹ یہ لے رہے ہیں۔ شاہ نامہ اسلام کے بھی محرّک یہی بنے۔

تھوڑا بہت ان واقعات میں مبالغہ ہو سکتا ہے۔ دس بیس فیصد، مگر یہ ماننا پڑے گا کہ اگر اُردو ادب کو حکیم یوسف حسن نہ ملتے تو ان میں سے بیشتر شاہکار منظرِ عام پر نہ آسکتے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو اُردو ادب جتنا شاداب اب نظر آتا ہے۔ اتنا کبھی نظر نہ آتا۔ یہی وجہ ہے کہ میرے نزدیک حکیم صاحب اُردو ادب کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ اس لیے انھیں اگر اکیس قلموں کی سلامی بھی دی جائے تو وہ کم ہو گی۔

شاہد احمد دہلوی مرحوم، جو ایک دوسری "دت" (فریق) کے آدمی تھے۔ وہ بھی حکیم صاحب کی صلاحیتوں کا اقرار کرتے تھے۔ سچ ہے، کہ وقتِ گزراں کے ساتھ واقعات کی صداقت کچھ نکھر جاتی ہے — ماند نہیں پڑتی :—

نیرنگِ خیال ایسا رسالہ نکلا کہ اس نے ہمارے ادبی رسالوں کی روش بدل ڈالی۔ حکیم یوسف حسن صاحب نے

ایک نئی بات یہ کی کہ پرچے کی ظاہری خوبیوں کی طرف بھی توجہ دی۔ نیرنگِ خیال سے پہلے رسالوں کے ٹائیٹل بالکل سیدھے سادے ہوتے تھے۔ رسالے کا نام اور ایڈیٹر کا نام بس! حکیم صاحب نے طرح طرح کے ڈیزائن بنوا کر کئی کئی رنگ میں بلاک کی چھپائی شروع کی۔ مضامین لکھنے کے لیے انھیں لاہور کے چند اچھے لکھنے والے مستقلاً مل گئے تھے۔ یہی حضرات بعد میں "نیاز مندانِ لاہور" بن گئے۔ سالک، امتیاز، پطرس، تاثیر، ہری چند اختر اور ایم اسلم کے مضامین نے نیرنگِ خیال کو ایک دم اچھال دیا۔ جب اس کی ساکھ بن گئی تو ہندوستان کے تمام اچھے لکھنے والوں کے مضامین بھی نیرنگِ خیال میں آنے لگے۔ دوسری تبدیلی حکیم صاحب نے یہ کی کہ نیرنگِ خیال کا سائز عام رسالوں سے بڑا کر دیا۔ تیسری اور سب سے بڑی تبدیلی جسے انقلاب کہنا چاہیے یہ کی کہ نیرنگِ خیال کے خاص نمبر اور سالنامے شائع کرنے شروع کر دیے۔ عام روش سے بچنے کے لیے حکیم صاحب نے نیرنگِ خیال کے خاص نمبروں کا سائز بڑھانا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ ان کا ایک خاص نمبر گز بھر لمبا بھی نکلا تھا۔ آسکر وائیلڈ کی تمثیل سلومی کا ترجمہ ڈاکٹر تاثیر

> کا کیا ہوا اُسی خاص نمبر میں چھپا تھا۔ ان کے ہر خاص نمبر میں ایک نہ ایک معرکے کا مضمون ضرور ہوتا تھا۔ مثلاً ایک میں شوکت تھانوی کا مضمون سودیشی ریل چھپا تھا۔ دوسرے میں عظیم بیگ چغتائی کا مزاحیہ مضمون "انگوٹھی کی مصیبت"، تیسرے میں قاضی عبدالغفار کے "لیلیٰ کے خطوط" ان مضامین کی اشاعت سے نیرنگِ خیال کو شہرت ہوئی اور نیرنگِ خیال کے ذریعے ان مضمون نگاروں کو شہرت ملی۔ حکیم یوسف حسن کو ہماری برادری میں مجتہد کا درجہ حاصل ہے، مگر افسوس کہ ادب کے اتنے بڑے خدمت گزار اور محسن کو زمانے کی گردشوں نے ماضی کے دھندلکوں میں محو کر دیا اور ناقدری نے اس عالمِ ضعیفی میں ملازمت کرنے پر مجبور کر رکھا ہے مگر اس ناداری میں بھی جفاکفا کر کے حکیم صاحب نیرنگِ خیال شائع کر رہے ہیں۔ یہ انہی کی ہمت ہے[1]۔"

میں نے جن باتوں کا اوپر ذکر کیا تھا کہ حکیم صاحب نے اُردو ادب کو بڑی نادر قسم کی تخلیقات سے مزین کیا تھا اور یہ بھی کہ کئی بڑے بڑے مصنفوں کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ تو وہ کوئی غلط نہ کہا تھا۔ شاہد احمد دہلوی

---
[1] نقوش، لاہور نمبر

نے بھی تصدیق کر دی۔ تصدیق تو واقعی وہ ہوتی ہے جو اہلِ زبان کریں۔ ہمارا کیا ہے۔

یہ تو اُردو کے لیے مرتے رہے۔ تن من دھن نچھاور کرتے رہے مگر کچھ بد باطن ایسے بھی تھے جنھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ حکیم صاحب کیا ہیں۔ لوگ مضمون بھیج دیتے ہیں اور یہ چھاپ دیتے ہیں تو انہیں بڑا غصہ آیا۔ غصے والی بات بھی تھی۔ اس لیے کہ پرچہ چھاپنا اتنا ہی آسان ہوتا تو اور حضرات بھی نیرنگِ خیال قسم کے پرچے نکال لیتے۔ چونکہ اچھا پرچہ چھاپنے کے لیے کسی حکیم یوسف حسن ایسے ہی باہوش باتدبیر اور صاحبِ قلم کی ضرورت تھی۔ اس لیے کوئی بھی ایسا پرچہ نہ نکال سکا۔ چونکہ غلط باتیں کرنا، حوصلہ شکنی کرنا، ہمارا قومی شعار بنتا جا رہا ہے۔ سو وہ ہم لوگ انجام دیتے رہتے ہیں۔ جزاک اللہ!

غصے میں آکر انھوں نے یہ سوچا کہ مجھے ایسے نمبر نکالنے چاہئیں، جس میں صرف حکیم یوسف حسن ہی یوسف حسن ہو۔ چنانچہ انھوں نے نیرنگِ خیال کے دو تین "ایڈیٹر نمبر" نکال ڈالے۔ جس میں صرف حکیم صاحب ہی نے مضامین لکھے اور کسی کی ایک سطر بھی نہ تھی۔ ممکن ہے حکیم صاحب کا خیال یہ ہو کہ خطۂ عاقلاں کے رہنے والوں کو تھوڑی سی عقل بانٹ دی جائے!

نہیں صاحب! اوروں کی بھی چند سطریں تھیں جو ہم نے ایک ایڈیٹر نمبر

میں بہ طور تعارف دیکھی تھیں۔ سیّد امتیاز علی تاج نے لکھا تھا:۔

میں نے ایڈیٹر نمبر کے تمام مضامین ذوق و شوق سے پڑھے ہیں اور ان کے مطالعے سے بہت لطف اندوز ہُوا۔ اس نمبر کے مختلف موضوع بڑی خوش مذاقی سے جمع کیے گئے ہیں۔ اور حکیم صاحب نے اپنے مخصوص و مقبول انداز میں ان پر دلآویز مضامین تحریر فرمائے تھے۔ شاعری اور مصوری کی کمی انتخاب درج کرکے پوری کر دی گئی ہے۔ اس طرح حکیم صاحب نے خریداران نیرنگِ خیال کی ضیافت طبع کے لیے دسترخوان بچھایا ہے کہ اس کے پُر لطف ہونے میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر حکیم صاحب کی یہ جدّت مقبول ہُوئی اور انھوں نے اس طرح زیادہ ایڈیٹر نمبر شائع کرنے شروع کر دیے اور دوسرے رسائل کے لیے بھی ان کی تقلید کرنے کے سوا چارہ نہ رہا تو ہم مضمون نگار یوسفِ بے کارواں ہو کر رہ جائیں گے۔

ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے لکھا تھا:۔

نیرنگِ خیال کی کامیابی کی وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا ایڈیٹر نبض شناس ہی نہیں۔ خود اہل درد میں سے ہے۔ قارئین نیرنگ خیال کو اپنے مضامین سے بھی خوش کر سکتا ہے اور ان

کی پسند کا انتخاب بھی کر سکتا ہے۔

حکیم یوسف حسن محض ادبی اشغال میں منہمک نہیں رہے بلکہ سیاسی اور معاشرتی اصلاح کے لیے بھی کوشاں رہے۔ ان کا ہفتہ وار "تازیانہ" اس قسم کی سرگرمیوں کا آئینہ دار تھا۔ ۱۹۹۲ء کا نقشہ بھی اسی قبیل سے ہے اور قارئین کے تخیل کے لیے تازیانہ کا کام دے گا ہر ایک کو نئی نئی باتیں سجھائے گا۔ اس میں قوم پرست، رجعت پسند، انقلابی ہر ایک سیاسی جماعت کے لیے کافی سامان غور و فکر ہے ہنسی ہنسی میں بڑے سپتے کی باتیں کہہ گئے ہیں۔ سیاسیات، ظرافت، افسانہ، ڈراما، تنقید، غرض ہر فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا۔۔۔ کے پورے پورے مصداق ہیں۔"

نیرنگِ خیال، جولائی ۱۹۳۰ء

معلوم ہوا کہ ضد میں آ کر یہ ایڈیٹر نمبر کی وبا حکیم صاحب ہی نے پھیلائی تھی۔ جس کی بعد میں تقلید نیاز فتحپوری نے بھی کی۔

یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم کسی کی صلاحیتوں کا اقرار کریں۔ ہم اسی فکر میں رہتے ہیں کہ کس طرح ٹانگ گھسیٹیں، کس طرح پریشان کریں، لعنت ہے ایسے افراد پر، ایسے ذہنوں پر کہ ہم اشرف المخلوقات میں سے ہیں اور حال یہ ہے کہ بخل کے اس مقام پر ہیں کہ جہاں ایک انسان کو، دوسرے

انسان میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ وہ دور اگرچہ تیس چالیس برس پہلے کا تھا۔ مگر ذہنیتوں میں فرق آج بھی نہیں پڑا۔ بُرائیوں میں بے مثال تھے۔ بے مثال ہیں! خوفِ خدا نہ تھا اور نہ ہے۔

حکیم صاحب کا نیرنگِ خیال کے ساتھ ساتھ "تازیانہ" جیسا بلند پایہ ہفت روزہ اخبار بھی چالو تھا میں نے "تازیانہ" کے پرچے دیکھے ہیں۔ خوب ہیں۔ وہ پرچہ خالصتاً ادبی نہ تھا۔ نیم سیاسی اور نیم ادبی قسم کا پرچہ تھا۔ پانچ برس تک تو ہفت روزہ کی صورت میں نکالا اور دو برس تک ماہانہ، اخباری سائز کے ستر اسی صفحات پر، جس کی اہمیت کو آج بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا! اگر حکیم صاحب یہی پرچہ نکالتے اور کچھ نہ کرتے تو بھی ایک دیانت دار ادبی مؤرخ کو ان کا نام احترام سے لینا پڑتا۔ چونکہ ادب کی وادی[1] میں محسن کُش لوگ بستے ہیں۔ اس لیے تازیانے کو کون پوچھے گا۔ جب کہ نیرنگِ خیال کو بھی کوئی نہیں پوچھتا۔

آپ کہیں گے پوچھتے کیوں نہیں۔ ہم تو اس کا نام آتے ہی گردن جھکا دیتے ہیں۔ اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ مگر میں پوچھتا ہوں، حکیم صاحب کو اس بیراگی کا ملا کیا؟ یہی نا کہ اس عمر میں بھی حالات کے ہاتھوں اپنی روزی

---

[1] زیادہ پڑھے لکھے لوگ وادی کو مذکر لکھتے ہیں۔

آپ کمانے پر مجبور ہیں۔ ورنہ بھوکے مر جاتے۔ ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا ہے۔ چاہے اسے اوڑھ لیں۔ چاہے بچھا لیں۔ چاہے کفن کے لیے رکھ لیں۔

کچھ ایسی ہی باتوں کو ذہن میں رکھ کر، میں نے نقوش کا ایک اداریہ بھی لکھا تھا۔

• پچھلے شمارے میں، میں نے مرحوم رسالوں کا ذکر کیا تھا آج ایک زندہ رسالے کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ جو عوام اور حکومت کی سرد مہری کی بنا پر مرحوم بننے کا فخر حاصل کرنے والا ہے میری مراد نیرنگِ خیال سے ہے۔

وہ نیرنگِ خیال جو ادب کی دنیا میں ایک مینار کی حیثیت رکھتا ہے۔

کوئی دو ہفتے ہوئے کہ حکیم یوسف حسن نے مجھے ایک اخبار کا تراشہ بھجوایا (جو نیرنگِ خیال کی شاندار کارگزاریوں پر مشتمل تھا) اور ساتھ ہی خط میں لکھا تھا کہ اب میری بوڑھی ہڈیاں موجودہ حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ عوام ناقدرشناس ہیں اور حکومت بے مہر! لہٰذا میرا اور نیرنگِ خیال کا اس دور میں زندہ رہنا مشکل ہو گیا ہے۔

آخر میں یہ بھی لکھا تھا کہ اب جب کہ زندگی کی قندیل بجھنے والی ہے تو میں نے مناسب سمجھا کہ یہ تراشہ آپ کو بھجوا دوں۔

ممکن ہے اس کی کبھی ضرورت پڑ جائے۔

وہ خط اس وقت میرے سامنے نہیں۔ الفاظ یہ نہ ہوں گے مفہوم یہی تھا۔

حکیم صاحب بھی خوب جانتے ہیں کہ میں مردہ پرست قوم میں پیدا ہوا ہوں۔ جو جیتے جی تو کسی کو نانِ شبینہ سے بھی محتاج دیکھ کر نہیں پسیجتی مگر مرنے کے بعد اس پر القا ہوتا ہے کہ ایک جوہرِ قابل مر گیا اور اس خلا کو کوئی پُر نہ کر سکے گا۔

مولانا صلاح الدین احمد کا قصہ سنیے: انھوں نے اپنا سب کچھ بیچ کر ادب کی آبیاری پر لگا دیا۔ جب تک زندہ رہے۔ کسی نے منہ نہ لگایا۔ بلکہ ایک جھڑپ میں ان کے ساتھ بڑا نامناسب سلوک کیا گیا مگر جب مولانا مر گئے تو حکومت کو بھی معلوم ہو گیا کہ ایک بڑی قد آور ہستی روٹھ کر چلی گئی ہے —— اور اس وقت اُن کی قبر پر انعام و اکرام کی بارش کر دی گئی۔

اے اللہ! ناقدرشناسوں کی اس دنیا میں تیرے یہ سادہ دل بندے کدھر جائیں؟ اور کیا سوچ کر اپنی زندگیاں ادب کیلیے وقف کر دیں؟

کیا اس امید پہ کہ مرنے کے بعد کسی امیر وزیر کی طرف سے

ایک بیان آجائے گا کہ ــــ مرحوم کی ادب کے سلسلے میں بڑی

خدمات ہیں ؟

کاش صاحبِ اختیار لوگوں میں کوئی ایک بھی ایسا باضمیر

ہو جو یہ اقرار کر سکے کہ مرحوم کی صلاحیتوں کو ہم نے کچلا تھا۔

اور ــــ ادب کے قتل میں ہمارا ہاتھ ہے۔

میرے بزرگ حکیم صاحب ! یہ قوم اور ملک کے صاحبِ اغنیاء

لوگ تو آپ کے لیے صرف اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ آپ کے مرنے

کا انتظار کریں اور پھر آپ کی قبر پر اپنی قدر شناسی کا بورڈ لٹکا دیں

(نقوش شمارہ ۱۰۶)"

ابھی میں نے "تازیانہ" کا ذکر کیا تھا۔ اُس کی اہمیت کیا تھی ؟ اس کا

دبدبہ کیا تھا ؟ اُس کے بارے میں ایک چھوٹا سا واقعہ سُن لیں۔

• "زمیندار" سے نکل کر جب عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر "انقلاب"

میں آ گئے تو یہ ایک دوسرے کے خلاف لکھنے لگے۔ مولانا ظفر علی خان سالک

و مہر کے خلاف ، مہر و سالک مولانا ظفر علی خان کے خلاف !

حکیم صاحب "تازیانہ" میں اُس آویزش کا ذکر کچھ اس ڈھب سے کیا

کرتے تھے کہ بظاہر اُس سے مولانا ظفر علی خان کی تعریف کے پہلو نکلتے۔

تعمق نظری سے دیکھا جاتا تو وہ مولانا کے خلاف ہوتا تھا۔ مثلاً یہ کہ مولانا

ظفر علی خان علم کا سمندر ہیں۔ شعر کے بادشاہ ہیں۔ سیاست کے ناخدا ہیں۔ وغیرہ وغیرہ مگر اس کے ساتھ آخر میں حکیم صاحب یوں لکھ دیتے کہ مولانا کو نہیں چاہیے کہ مہر و سالک کے منہ لگیں۔ اس لیے کہ یہ بات ان کے مرتبے سے فروتر ہے۔ بہ ظاہر کچھ بین السطور ہیں کچھ!

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ اُن دنوں مجھے لال دین قیصر نے یہ بتایا تھا کہ جب ملک صاحب نے مولانا ظفر علی سے کہا کہ آپ مہر و سالک کو بخش دیں۔ اُن کے خلاف نہ لکھا کریں تو مولانا ظفر علی خاں نے کہا میں مہر و سالک کو کیا سمجھتا ہوں۔ وہ میرے پڑھائے ہوئے ہیں۔ وہ میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ مگر میں حکیم یوسف حسن کی تحریروں سے پریشان ہوں اُن کا میرے پاس جواب نہیں۔

ایک بات بھول نہ جاؤں۔ وہ پہلے سُن لیجیے۔ اس کے بعد اور باتیں ہو جائیں گی۔ وہ یہ کہ حکیم صاحب ملک کے بڑے بڑے فن کاروں کو "ادبی خطابات" سے بھی نوازا کرتے تھے۔ یہ اپچ بھی انہی کی ہے۔ جسے اہلِ قلم انگریزوں کے خطابات، سر اور خان بہادر سے زیادہ اہم جانتے تھے۔ مثلاً ۱۹۳۵ء میں انھوں نے جنھیں اور جو جو خطابات دیے۔ وہ عرض کرتا ہوں:

علامہ: سر عبدالقادر، ممبر انڈیا کونسل لنڈن — پروفیسر محمد دین تاثیر ایم۔ اے (کیمبرج انگلستان) — ڈاکٹر مولوی سید نجم الدین احمد ایل ایل ڈی بیرسٹرایٹ لا — آنریبل سر تیج بہادر سپرو پی سی، بیرسٹرایٹ لا، الہ آباد۔

ادیب العصر: لطیف الدین احمد (ل - احمد) آگرہ ــــ قاضی عبدالغفار
مراد آبادی (حیدر آباد) ــــ مولانا عبدالمجید سالک، روزنامہ انقلاب لاہور۔
ادیب الملک: نذر سجاد حیدر غازی پوری ــــ حجاب اسمٰعیل (مسز تاج)
ــــ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی ــــ پروفیسر حامد اللہ افسر میرٹھی بی۔اے
(لکھنو) ــــ مولانا تاجور نجیب آبادی (لاہور)
ملک الشعرا: مولانا ظفر علی خان مدیر "زمیندار" لاہور
لسان العصر: نواب سائل دہلوی ــــ پنڈت دتاتریہ کیفی دہلوی
جوش ملیح آبادی ــــ سیماب وارثی اکبر آبادی (آگرہ)
لسان الملک: یاس عظیم آبادی ــــ جگر مراد آبادی۔
لسان القوم: پنڈت ہری چند اختر ــــ ساغر نظامی
مدیر اعلیٰ: عزیز حسن بقائی ــــ مدیر پیشوا دہلی ــــ لالہ کرم چند
مدیر پارس لاہور ــــ نصراللہ خاں عزیز بی۔اے مدینہ بجنور ــــ شاہد احمد
دہلوی بی۔اے آنرز مدیر "ساقی" دہلی ــــ حامد علی خاں بی۔اے مدیر ہمایوں لاہور
ــــ مولوی سید محمد جعفر بی۔اے ایڈیٹر ملت دہلی
بہزاد ہند: اُکیل دہلوی ــــ الہ بخش لاہوری
مصور قلم: شوکت تھانوی ــــ بلقیس جمال بریلوی ــــ مرزا عظیم بیگ
چغتائی ــــ شمسی عباد الرحمٰن (علی گڑھ) ــــ صفوۃ اللہ بیگ صوفی دہلوی۔

ابو طاہر داؤد بی۔ ایس۔ سی ——— عبدالرحیم شبلی بی۔ اے (کامرس) ———
مظہر انصاری بی۔ اے آرزو دہلوی۔ ——— سیّد خواجہ وکیل ہائیکورٹ حیدرآباد دکن۔

خطابات کی اپج کے علاوہ انھوں نے عنوانات قائم کرنے میں بھی ندرت دکھائی مثلاً اختر شیرانی کی نظم کا عنوان، "لمعاتِ اختر" ۔ جگر مرادآبادی کا عنوان "داغِ جگر"۔ غرض اسی طرح کی اور بہت سی اختراعات!

اسی طرح سالانہ نمبر یا اینول نمبر (Annual Number) کا نام لفظ سالنامہ بھی نیرنگِ خیال کی دین ہے۔

ہمارے نیاز فتحپوری کی عادت تھی کہ وہ چڑھتے سورج کی مخالفت کیا کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ڈاکٹر اقبال کے بارے میں کبھی پوری دیدہ دلیری سے لکھا:۔

اوّل اوّل جب میں نے کلامِ اقبال کا مطالعہ کیا تو ان کے خیال کی رفعت اور جذبات کی اثریت کو سامنے رکھ کر جو صورت میں نے ان کی قائم کی تھی۔ وہ یہ تھی:
ایک نحیف الجثہ انسان (دماغی ترقی اور جسمانی ترقی دونوں کا اجتماع میرے ذہن میں نہیں آتا) بڑی چمکیلی آنکھیں، داڑھی اگر ہوئی تو مسترسل الشعر قسم کی ورنہ چار ابرو کا صفایا۔ ہنستے کم ہوں گے لیکن باریک جلد کے نیچے ایک قسم کا نورانی خندہ ہر وقت

جھلکتا ہوگا۔ معاشرت نہایت سادہ مگر پاکیزہ ہوگی۔ بلحاظ اخلاق
کے عجز ہوں گے۔ بات بات پر آنکھیں اشک آلود ہو جاتی ہوں گی
اور بحیثیت مجموعی ان میں ایک کشش ہوگی کہ انسان خود بخود ان
کی طرف کھنچ جاتے ہوں گے۔ لباس بالکل مشرقی ہوگا اور نمائش
سے بالکل دور! لیکن جب میں ان سے ملا تو مجھے کسی قدر تکلیف
ہوئی کہ وہاں ایک بات بھی میری مزعومات کے مطابق نہ تھی۔

یہ باتیں اہلِ پنجاب کو ناگوار گزریں۔ بھلا لباس سے علمیت کا کیا تعلق؟
بھٹا کے حکیم صاحب اداریہ لکھتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ اپنے آپ کو پنجاب کا
واحد نمائندہ سمجھتے ہیں۔ ہر معرکے میں حصہ لینا ان کے مزاج میں داخل ہے۔
لہٰذا چپ کیسے رہتے لنگوٹ کس کے میدان میں آگئے۔ جواب میں لکھا:۔

"ہم حیران ہیں کہ نیاز صاحب نے علامہ اقبال کے کلام
سے ان کے نحیف الجثہ ہونے پر کس طرح حکم لگا دیا۔ علامہ
موصوف کے کلام میں ایسا کوئی عنصر نہیں ہے۔ جس سے
بانکپن اور نسائیت ٹپکتی ہو۔ نہ ان کے ہاں یاس و حرماں کے مضامین
ہیں نہ مایوسی اور ناامیدی کی تلخی پائی جاتی ہے بلکہ وہاں زندگی
کا ایک بحرِ ذخار ہے جو جبل پیکر موجیں لیے چلا آتا ہے اور جو چیز
سامنے آتی ہے بہالے جاتا ہے۔ وہ خون شدہ آرزوں اور منفعل گشتہ

حسرتوں کے ماتم گسار نہیں بلکہ تخلیق تولید مقاصد کے مدعی ہیں ۔۔ وہ عرصۂ حیات کو ایک تماشائی کی نگاہ سے مشاہدہ نہیں کرتے بلکہ وہ ایک امیر الجیش اور سر عسکر کی حیثیت سے اس کی روئداد بیان فرماتے ہیں ۔ ان کا رفیع اور پُر وقار تخیل آپ کے ہم جلیس شعراء کی طرح کمر دہن کی باریکیوں میں سرگشتہ نہیں پھرتا بلکہ وہ رازِ حیات سے آشنا ہو کر بصد صولت و بصالت سے

تیغ و سنان و خنجرم و شمشیرم آرزو است
با من میا کہ مسلکِ شبیرم آرزو است

کے جگر پاش نعروں کے ساتھ بلند ہوتا ہے ۔ تعجب ہے کہ اس ہنگامہ آرائی، محشر خیزی، ایک معرکۂ کرب و بلا برپا کرنے کی آرزو کے باوجود اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے ۔

حضرت علامہ کے کلام کا پُر وقار اور شاندار ترنم، اس کی بلند آہنگی، سوز و گداز، عمیق تفکر اور وہ تشکیک سوز آتش ملتہب جس کو نکلسن ایک کوہ آتش افروز بتاتا ہے ۔ سب نیاز صاحب کے استنباط کے خلاف گواہی دیتے ہیں ۔ ضرورت ہے کہ نیاز صاحب کلام اقبال کا چندے اور مطالعہ فرمائیں ۔

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

آگے چل کر آپ ناطقانہ انداز میں جو حضرت نیاز کی خصوصیت ہے فرماتے ہیں:

"دماغی ترقی اور صحتِ جسمانی' دونوں کا اجتماع کبھی میرے ذہن میں نہیں آیا" بجا ارشاد ہے۔ آپ کے ذہن میں ان دونوں کا اجتماع کیوں آنے لگا۔ یہی غنیمت ہے کہ اس میں "وسعتِ نظر" اور "ندرتِ خیال" کے بلند بانگ دعاوی کے ساتھ شیعہ سنی کی تفریق اور پنجاب و یو۔پی کا امتیاز اور یہ تو آگیا کہ کیوپڈ اور سائکی کے ترجمہ کو طبع زاد کہہ کر کس طرح شائع کیا جاتا ہے۔ رہا جسمانی ترقی اور صحت کا اجتماع' یہ تو آپ کے دماغ میں اُس وقت تک نہیں آئے گا۔ جب تک آپ دنیا کی عظیم الشان شخصیتوں کا مطالعہ نہ فرمائیں گے۔ ملٹن' شیکسپیئر' گوئٹے' ڈاکٹر جانسن' گولڈسمتھ' گلیمن' شو' رڈرڈ لاٹ' لائڈ جارج' ایچ' جی ویلز' ایچ وارث پیچ' ولیم جیمس کو نیاز صاحب شاید شعرا اور بڑے آدمیوں میں سے نہ مانیں۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ ایک زمانہ ان کی دماغی قابلیت کا معترف ہے اور بدقسمتی سے صحت جسمانی بھی ان کی دماغی ترقی سے مجتمع ہے۔ نیاز صاحب کا یہ نظریہ ان کے نہاخانہ کی باریکیوں تک ہی محدود رکھا جائے

تو شاید صحیح ہو۔ لیکن جہاں تک دنیائے علم و ادب کا تعلق ہے اس
کو کلیہ قرار دینا سراسر غلط اور جہالت پر مبنی ہے اور داڑھی کے
متعلق جو ارشاد ہُوا ہے یہ بھی جناب کی عقل کا پھیر ہے۔ اس سے
بڑھ کر حماقت کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ کسی شاعر کے کلام کے مطالعہ کے
بعد داڑھی اور اس کی نوعیت کے متعلق حکم لگایا جائے اگر ہو سکتا ہے تو ہم
نیاز صاحب سے دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ کیا نئے نئے سوانگ بدلنے سے
آپ کے اندازِ بیان میں بھی فرق پڑتا ہے جس سے قاری اس امر کا اندازہ
لگا سکے اگر نہیں، اور ہر حالت میں آپ کا اندازِ بیان اور "حسنِ تخیل" وہی رہتا
ہے۔ خواہ آپ ٹیگور کا بہروپ بدلیں یا اپنی حد درجہ شاعرانہ طبیعت کے مطابق
حد درجہ شاعرانہ انداز میں کمبل اوڑھ کر مچھندروں کی سی صورت بنا لیں جیسا کہ شروع
سے آپ کا معمول رہا ہے تو فرمایئے شعر کے مطالعے سے داڑھی کے متعلق کیا
کہا جا سکتا ہے۔ علامہ موصوف کی سی معلمِ اخلاق ہستی کی پاکیزہ اور سادہ معاشرت
خلقِ اخلاق دلچسپ اور دلآویز اندازِ تقریر کے متعلق آپ کے
نقالوں کی ہرزہ سرائی کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ ان باتوں کو علمائے
مشرق و مغرب جنہیں حضرت علامہ سے شرفِ نیاز حاصل ہُوا ہے
اور وہ بھی بے شمار مشتاقانِ جمال جو ہر روز زیارت کے لیے
آتے رہتے ہیں۔ اچھی طرح جانتے ہیں۔ آپ ایک بار کیا

لاکھ بار آسمان پر تھوکیے لیکن یہ فراموش نہ کیجیے کہ یہ آپ کے حد درجہ شاعرانہ رُخ مبارک پر آگر پڑے گا۔ کاش نیاز صاحب اس قسم کی حد درجہ شاعرانہ باتیں لکھنے سے پیشتر اُن آرا، کو دیکھ لیتے یا ہم سے منگوا لیتے جو بڑی بڑی شخصیتوں نے علامہ موصوف کی ملاقات سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔

علامہ موصوف کے کلام ہی سے ظاہر ہے کہ آپ کے جذبات کس قدر حساس واقع ہوئے ہیں اور جنھیں حضرت علامہ سے ذاتی طور پر شرفِ نیاز حاصل ہے وہ اس امر کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ابھی چند روز ہوئے جب علی گڈھ میں حضرت علامہ کی موجودگی میں "معقدیہ" پر آپ کی مشہور نظم ؎

روئے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

پڑھی تو جہاں دیگر سامعین کی آنکھیں اشکبار تھیں وہاں علامہ موصوف بھی زار و قطار رو رہے تھے لیکن ہمارے خیال میں یہ کبھی نہ آیا تھا کہ قوم کی حالت پر رونے والے فلسفی کو یو۔ پی کے ایک برخود غلط ادیب کی ذہنیت پر بھی رونا چاہیے۔ اس میں شک نہیں نیاز صاحب کی حد درجہ شاعرانہ قطع و برید وافعی سزاوار

ترحم ہے اور ان کی "دماغی ترقی" ندرتِ خیال کا جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ یہ صفِ ماتم پنجاب کی "حددرجہ غیر شاعرانہ" سرزمین میں ہی برپا کی جائے اور اسی حضرت کی کشش ہی تھی جو آپ سے متکبر اور ہمچو ما دیگرے نیست رٹنے والے جوتیاں چٹخاتے یہاں تک آ گئے تھے۔ نیاز صاحب حددرجہ شاعرانہ انداز میں فرماتے ہیں۔ "میں کبھی یہ نہ سمجھ سکتا تھا کہ وہ شلوار پہنتے ہوں گے جو مرد کے لیے حددرجہ غیر شاعرانہ ملبوس ہے اور اونچا کوٹ جو پنجابی یونیفارم کا جزوِ لاینفک ہے استعمال کرتے ہوں گے جسے کم از کم فلسفیانہ ذہنیت کا انسان کبھی پسند نہیں کر سکتا۔" دروغ گو را حافظہ نباشد، ابھی آپ کو یہ شکایت تھی۔ آپ کی یہ توقع کہ علامہ موصوف کا لباس مشرقی وضع کا اور نمایش سے بالکل دور ہو گا۔ غلط ثابت ہوئی۔ اگر شلوار اور اونچا کوٹ استعمال کرنا جو خود نیاز صاحب کے الفاظ میں پنجابی یونیفارم کا جزوِ لاینفک ہے۔ مشرقی وضع کے خلاف ہے تو مشرقی وضع سے آپ کی مراد کمبل اوڑھنے کا وہ حددرجہ شاعرانہ انداز ہو گا جو آپ نے ان دنوں اختیار کر دیا تھا۔ جب آپ پر سنگوریت کا بھوت سوار تھا اور جس نے

اب آپ کو "جن شکے سے حد درجہ شاعرانہ رسالے کے اجرا پر مجبور کر دیا ہے۔

یہ بھی نیاز صاحب کی حد درجہ شاعرانہ فتح پوری منطق ہے جس کا سمجھنا غیر شاعرانہ ذہنیت کے آدمی کا کام نہیں۔

یہ امر واقعی کس درجہ مضحکہ خیز اور حد درجہ شاعرانہ ہے کہ ایک یو۔پی کا رہنے والا جب دنیا کے کسی خطے کے باشندے کا تصور کرتا ہے تو عالم خیال میں اسے وہی اچکن، چوڑی دار پاجامہ اور دوپلّے کی ٹوپی اوڑھے دیکھتا ہے۔ جس کا وہ خود عادی ہوتا ہے۔ اس بھلے آدمی سے کوئی پوچھے کہ اگر آپ برنارڈ شا، گالزوردی اور آرنلڈ بینٹ یا اردن کوب وغیرہ کو جن کے متعلق آپ یہی زعم رکھتے ہوں کہ فتحپور کے حد درجہ شاعرانہ لباس میں ملبوس ہوں گے۔ حد درجہ غیر شاعرانہ مغربی لباس میں دیکھ کر سٹ پٹا جائیں تو اس میں اُن بیچاروں کا کیا قصور ہے۔ علامہ اقبال پنجاب سے تعلق رکھتے ہیں پنجابی ہیں اور وہ پنجاب کا لباس ترک کر کے یو۔پی معاشرت کیوں اختیار کریں۔

"رہا شلوار کا حد درجہ غیر شاعرانہ ہونا۔" تو جناب یو۔پی

کے دو ممتاز ادیبوں کے اچھے خاصے شگفتہ نام عبدالباری اور
حامداللہ آپ کے نزدیک حد درجہ غیر شاعرانہ ٹھہرتے ہیں تو شلوار
کی کیا حقیقت ہے۔ جسے پنجاب کی حد درجہ غیر شاعرانہ سرزمین
سے ایک خاص مناسبت ہے۔ آپ اس کے حد درجہ غیر شاعرانہ
ہونے کے متعلق کیا فرماتے ہیں۔ وعادت کیجیے اچکن کو جس نے آپ
کی پردہ پوشی کر رکھی ہے اور جس کے بغیر آپ مشاعرانہ ہیل" نظر آتے ہیں آپ
کہتے ہیں اُونچے کوٹ کو کم از کم فلسفیانہ ذہنیت کا انسان کبھی پسند نہیں کر سکتا
فلسفہ سمجھنے کے دعویدار آپ کب سے ہوئے ہیں اور فلسفہ میں پڑھا ہی کیا ہے
جو فلسفیانہ ذہنیت جتانے لگے۔ فارسی کی دو تین کتابیں پڑھنے اور الہلال
سے ترجمہ کر کے اپنے نام سے چھپوانے کا نام فلسفہ نہیں ہے۔ رسالہ جن کے
اجرا کرنے اور بھوت پریت میں ایمان رکھنے والے ڈھلمل یقین قسم کے لوگ
فلسفی بھی کب ہو سکتے ہیں۔ آپ کو فلسفہ سیکھنا ہے تو علامہ ممدوح کے ادنیٰ ترین
خادموں کے آگے زانوئے ادب تہہ کیجیے فیچو رہیں چلّے کاٹتے کسی کو فلسفی بنتے دیکھا
نہیں آج تک!

علامہ ممدوح کے تلفظ پر وہی شخص حرف رکھ سکتا ہے
جس نے عقل و خرد کو بالکل جواب دے دیا ہو اور جس کے تمام
قوائے ذہنی کو تعصب نے معطل و ناکارہ کر دیا ہو۔ عجمی اور عربی

علما بھی آئے دن حضرت علامہ کی زیارت کے لیے آتے ہیں لیکن
آج تک کسی نے قیام کو کیام نہیں سُنا۔ یہ بھی محض آپ کی سماعت کا
فرق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نہایت متناسب الاعضا اور تندرست
انسان ہیں۔ موزوں ساخت کے چہرے پر ایک پُروقار دلکشی
اور نور برستا ہے۔ جسے مردانہ حسن کا شان دار اور مکمل نمونہ کہا
جا سکتا ہے۔ نگاہوں میں ایسی دلفریب کشش ہے کہ انسان
خود بخود ان کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ لیکن نیاز صاحب اپنی فطرت
سے مجبور ہو کر فرماتے ہیں۔ "جسم پہلوانی کے لگ بھگ فربہ
تربیت یافتہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ نے آج تک پہلوان دیکھے
ہی نہیں اور آپ کا پہلوان کا تصور بھی اس قدر غلط ہے جس قدر
آپ فلسفہ سے کورے ہیں۔ وہ کوئی لکھنؤ کا بانکا ہو گا جسے
آپ اپنی سمجھ میں پہلوان بنائے بیٹھے ہیں۔ کبھی آپ کلو، گونگا
اور گاماں (ہر چند آپ کی حد درجہ شاعرانہ طبع پنجاب کی حد درجہ
غیر شاعرانہ ناموں کی متحمل نہ ہو سکے گی۔ لیکن کیا کیا جائے کہ
آپ کو پہلوان بھی ضرور دکھانا چاہیے۔ تاکہ آیندہ پھر کبھی ایسی
غلطی نہ کر بیٹھیں) کو دیکھ لیتے تو آنکھیں کھل جاتیں کہ اللہ تیری
شان پہلوان یہ ہوتا ہے۔ آپ حقیقتاً حضرت علامہ کو پہلوان

سمجھنے میں معذور ہیں اور حقّے کے متعلق بھی سارا قصور آپ کے
متعفّن دماغ کا ہے، جس میں اس وقت فتح پور کے کسی بھٹیار خانے
کا تصور سمایا ہوگا۔ ورنہ ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی لاہور کی کشادہ
کوٹھیوں میں سے ہے۔ اس کی فضا نہایت پاکیزہ اور لطیف
رہتی ہے۔ اس کا گول کمرہ ٹینس کے لان سے کسی طرح کم کشادہ نہیں۔

ایاز قدر خود بشناس!

سنا جناب حد درجہ شاعرانہ اور غیر شاعرانہ صاحب!
آپ اپنی اوقات پہچانیے اور ڈاکٹر صاحب کے متعلق ہرزہ سرائی
کرکے چھوٹا منہ اور بڑی بات کے مصداق نہ بنیے۔ ایک محدود
حلقے میں جو رہی سہی توقیر باقی ہے آپ اُسے بھی ضائع
کر بیٹھیں گے۔"

اقتباس طویل ہوگیا ہے۔ اس کی معذرت! مجھے یہاں صرف یہ عرض
کرنا ہے کہ حکیم صاحب نے ایک بڑے نازک مسئلے کو چھیڑا تھا۔ لہجہ بھی تند و
تیز استعمال کیا تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں دلّی اور یو۔ پی کے دوست خفا نہ ہوجائیں، مگر
انھوں نے اپنا اداریہ اس طرح ختم کیا:۔

"ہم نے حضرت نیاز کی زہریلی تحریر کے اُن جملوں کو نقل
کرکے رسالہ کو ناپاک نہیں کیا جو ان کے صحیفہ میں شائع ہوئے تھے۔

ہم یو۔پی کے سخن فہم اصحاب کو عموماً اور لکھنؤ کے اہل الرائے حضرات کو خصوصاً توجہ دلاتے ہیں کہ وہ حضرت نیاز فتحپوری کی اس عیارانہ تحریر پر سختی سے نوٹس لیں اور پوری کوشش کریں کہ اُمّتِ مرحومہ کے سربرآوردہ اور واجب التعظیم بزرگوں کی اس درجہ توہین پر وہ اظہارِ ندامت کریں اور اگر وہ اس پر تیار نہ ہوں تو اہلیانِ لکھنؤ ان کے سر پر جو "جن" مسلط ہے۔اس کے نکالنے کا انتظام فرمائیں"
(نیرنگِ خیال، جنوری ۱۹۳۰ء)

یہ ہے ایڈیٹر کی قابلیت یا اُس کا مقامِ گفتگو کہ وہ نازک مرحلوں سے بھی سرخرو گزرے۔ ورنہ اس جھگڑے میں اہلِ زبان کا ناراض ہو جانا لازمی امر تھا (ایسے مواقع پر اکثر معقولیت اور نامعقولیت کو بھی دھیان میں نہیں رکھا جاتا) مگر حکیم صاحب نے اس معاملے کو پوری ہوش مندی سے سنبھالا۔یہی وجہ تھی کہ میں نے سُنا تھا کہ اس معاملے میں "اہلِ اُردو بھی حکیم صاحب کے ہمنوا تھے اور نیاز صاحب کے رویّے کو ناپسند کر رہے تھے۔ اسے کہتے ہیں تلخ نوائی میں شیریں کلامی!

میں نے مندرجہ بالا طویل اقتباس کو (یا اور اقتباسات کو) اس سبب بھی درج کرنا مناسب سمجھا کہ بہانے بہانے سے حکیم صاحب کے اندازِ تحریر اور اندازِ فکر کا بھی سراغ ملتا جائے یوں میں نے بزعمِ خود ایک تیر سے دو نشانے

سکیے ہیں۔ یہ الگ بات کہ ایک بھی تیر نشانے پر نہ لگا ہو۔

میں نے حکیم صاحب سے پوچھا۔" آپ نے اس وقت علامہ اقبال کی وکالت تو خوب کی تھی۔ علامہ بھی خوش ہوئے تھے کہ نہیں؟"

کہنے لگے۔" وہ ان چیزوں سے بالا تھے۔ مَیں نے جب وہ پرچہ علامہ کی خدمت میں پیش کیا تھا تو وہ نوٹ پڑھ کر صرف مسکرا دیے تھے۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ مجھ میں بھی ہمت نہ تھی کہ پوچھ لیتا۔ کیسا رہا یہ اداریہ؟"

" آپ کے علامہ سے تعلقات کیسے تھے؟"

"لوگ تو یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ہمارے علامہ سے بڑے تعلقات تھے۔ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ ہر آدمی یہ کہہ رہا ہے کہ علامہ میرے دوست تھے، مجھ سے مشورہ لیا کرتے تھے مگر میں اس ضمن میں یہ کہوں گا کہ مَیں تو ان کے ہاں حاضری پر ہی فخر کیا کرتا تھا۔ میری نہ اُن سے دوستی تھی۔ نہ وہ مجھ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ علامہ کی مجھ پر یہی مہربانی بہت تھی کہ انھوں نے مجھے اپنے ہاں بیٹھنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ لذتِ بیداری مجھے اُسی چوکھٹ سے ملی تھی۔ ورنہ مَیں اس سے آشنا ہی نہ تھا۔

ایک دن مَیں نے علامہ سے گزارش کی۔ نیرنگِ خیال کے لیے کوئی نظم دیجیے۔ انھوں نے فرمایا۔" نئی چیز کوئی نہیں ہے۔"

میں نے یاد دلایا کہ" جب مَیں پچھلی مرتبہ حاضر ہُوا تھا تو آپ نے حاضرین

کو ایک نیا شعر سنایا تھا :-

یہ پنڈت، یہ بنیے، یہ مُلّا، یہ لالے
یہ سب پیٹ ہیں اور ہم تر نوالے

اس کے بعد کچھ شعر اور ہوئے ہوں گے۔"
کہنے لگے اور کوئی شعر نہیں ہُوا۔ وہی ایک ہے۔ پھر تھوڑی دیر
بعد فرمایا۔ اچھا لکھو :-

یہ مکتب یہ اسکول یہ پاٹھ شالے
یہ تکیے، یہ مندر، یہ گرجے شوالے
یہ پنڈت، یہ بنیے، یہ مُلّا، یہ لالے
یہ سب پیٹ ہیں اور ہم تر نوالے
غریبوں کا دنیا میں اللہ والی

وطن کیا ہے اک نوعِ سرمایہ داری
بڑے سیٹھ ہیں قوم کے یہ بھکاری
یہ دیکھو وہ چلی آ رہی ہے سواری
نئے جال لائے پُرانے شکاری
غریبوں کا دنیا میں اللہ والی

(نیرنگ خیال ۱۹۲۸ء)

جب فی البدیہہ اتنے اشعار لکھوا چکے تو فرمانے لگے۔ "اگر یہ شعر کام آسکیں تو چھاپ دیجیے مگر مجھے اس کی نقل دیتے جائیں۔"

اس کے بعد حکیم صاحب نے فرمایا کہ میں علامہ کی خدمت میں مہینے میں ایک دو بار ضرور حاضری دیا کرتا تھا۔ میں ایک دن علامہ کی خدمت میں حاضر تھا کہ مولانا ظفر علی خان بے حد گھبرائے ہوئے آئے۔

علامہ نے پوچھا۔ "خیر باشد؟"

"خیریت کہاں ہے؟"

"کیوں؟"

گورنمنٹ نے ایک سرکلر بھیجا ہے کہ ہم اپنی طرف سے پانچ لاکھ روپے دیں گے اور پانچ لاکھ روپیہ مسلمان اکٹھا کریں تاکہ حجاز میں ہسپتال بنوائے جائیں۔ کیونکہ حج کے موقع پر مسلمانوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔"

"پھر؟"

مولانا پہلے ہی پریشان تھے۔ حد درجہ مضطرب، گلوگیر انداز میں جواب دیا۔ "یہ انگریزوں کی چال ہے، جس میں وہ مسلمانوں کو بھی شامل کر کے دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ انگریز جہاں ہسپتال یا رفاہی ادارے بنواتے ہیں۔ وہاں پہلے اسی قسم کی حرکتیں کرتے ہیں۔ پھر اپنا اثر رسوخ استعمال کر کے قبضہ کر لیتے ہیں۔ اس لیے حجاز بھی مسلمانوں کے

ہاتھوں سے نکل جائے گا۔"

علامہ نے فرمایا۔" معاملہ بے شک سنجیدہ ہے مگر آپ پریشان نہ ہوں۔ شام کو اپنا چپڑاسی بھیج دیجیے گا۔ میں اُسے چار پانچ شعر لکھ دوں گا۔ وہ اپنے اخبار میں چھاپ دیجیے گا۔ پھر نہ کوئی چندہ دے گا۔ نہ ہسپتال بنیں گے۔ نہ انگریز کی چال کامیاب ہوگی۔"

چنانچہ علامہ نے "شفاخانہ حجاز" کے نام سے ایک نظم لکھی۔ جو زمیندار میں چھپی۔ نظم کے چھپنے سے مسلمان خبردار ہو گئے۔ چنانچہ انگریز کی اسکیم دھری رہ گئی۔

حکیم صاحب نے فرمایا۔" اُس نظم میں بڑا تاثر تھا۔ میں آپ کو ایک دو شعر سناتا ہوں:

اک پیشوائے قوم نے اقبالؔ سے کہا
کھلنے کو جدہ میں ہے شفاخانۂ حجاز

اس نظم کا ایک اور شعر ہے ؎

دار الشفا حوالیٔ بطحا میں چاہیے
نبضِ مریض پنجۂ عیسیٰ میں چاہیے

مگر جب علامہ کا یہ شعر حکیم صاحب نے پڑھا ؎

اوروں کو دیں حضور یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

تو حکیم صاحب رو پڑے۔ بُری طرح روئے مجیب گداز دل پایا ہے۔ سرمایۂ درد نعمت ہے۔ جسے بھی ملے۔ حکیم صاحب کی جو حالت تھی۔ وہ تو تھی ہی، مجھے بھی اُٹھ کر منہ دھونا پڑا۔

یہ بات مجھے حکیم صاحب ہی سے معلوم ہُوئی کہ اس نظم کا پس منظر کیا تھا اور پیشوائے قوم کون تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا۔ بڑی تاثیر تھی علّامہ کے کلام میں، امامِ عاشقانِ درد مند تھے۔ یہ ترکیب علّامہ ہی کی ہے، جو اُن پر صادق آتی تھی۔

تاثیر کی بات پوچھتے ہو؟ لو ایک قصہ اور سنو:۔

علّامہ اقبال نے جنگِ طرابلس کے دنوں میں ایک نظم لکھی۔ نام تھا اس کا "حضورِ رسالت مآبؐ میں" یہ نظم شاہی مسجد لاہور میں، ہزاروں لاکھوں کے مجمعے میں، علّامہ نے بڑے ہی دل سوز قسم کے ترنم سے پڑھی۔ ایک تو علّامہ نے اُس دن جس سوز سے نظم پڑھی تھی۔ وہ سماں بھی دیکھنے اور سننے والا تھا۔

نظم پڑھنے سے پہلے سر شفیع، سر فضل حسین اور مولوی محبوب عالم ایسے اکابرین نے بڑی آتشیں تقریریں کی تھیں۔ جن میں اٹلی کے خلاف مسلمانوں نے اپنے غیظ و غضب کا اظہار کیا تھا۔ اس کے بعد علّامہ نے نظم سنانی شروع کی۔ مجمعے پر ایک عجیب قسم کا سکوت طاری ہوگیا۔ فرش پر سُوئی بھی گرتی تو آواز آتی۔ علّامہ نے جب پوری سرشاری کے ساتھ یہ شعر پڑھا ؎

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں

جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

تو لوگوں کا تجسس بڑھا۔ سوال پیدا ہُوا۔ بھلا وہ کیا چیز ہوگی، جو جنت میں بھی نہیں ملتی۔ اس کے بعد جب علامہ نے یہ شعر پڑھا ؎

جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں

طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

تو مجمع بے قابو ہوگیا۔ اللہ اکبر کے فلک شگاف نعرے، نالہ و شیون اور آہ و بکا کا ایسا سماں کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ جوش اتنا تھا کہ لوگوں نے اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ فرش پر تڑپنے لگے۔ آدم کی تڑپ کا وہ سماں ضمیرِ کائنات میں اپنی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ جو اس چشمِ فلک نے شاذ ہی دیکھا ہوگا۔

حکیم صاحب یہ واقعہ سناتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔ مجھے بھی اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ کہنے لگے اُس دن میرا جی چاہتا تھا کہ غیر ملکی حکومت کے سارے آثاروں کو مٹادوں اور خود پھانسی پر لٹک جاؤں۔

حکیم صاحب نے یہ بھی بتایا کہ اس واقعہ کے دوسرے یا تیسرے دن، میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہُوا تو حاضرین میں سے کسی نے علامہ اقبال کے شاہی مسجد میں پڑھی جانے والی نظم کا ذکر چھیڑ دیا اور کہا کہ اُس دن خیریت ہی گزر گئی۔ ورنہ جو حال پبلک کا تھا۔ اس سے اندیشہ تھا کہ کہیں لوگ بے قابو

ہو کر ہنگامہ برپا نہ کریں۔

اس پر علامہ نے فرمایا۔ "اچھا ہی ہُوا جو مسلمان اپنے آپ میں رہے ورنہ مَیں چاہوں تو اپنے شعروں سے آگ لگا دوں مگر مَیں دیکھتا ہوں کہ ابھی میری قوم تیار نہیں ہے۔"

حکیم صاحب سے جب مَیں نے ایسے ایسے واقعات سُنے تو مزید کرید کی جستجو ہوئی۔ نوائے عاشقانہ کو دل اور مچلا۔ مگر میرے استفسار پر کہ علامہ کا کوئی اور واقعہ بھی سُنائیے۔ حکیم صاحب کہنے لگے یار! اب مَیں تھک گیا ہوں بوڑھا آدمی ہوں۔ ۷۶ برس کی عمر ہے۔ پھر کبھی سہی!"

"پھر کبھی نہیں۔ آج ہی!"

"آج کی بات تو پھر یہ ہے کہ تم شام کو گھر آجانا۔ مَیں تمھیں علامہ کا ایک اور قصہ سناؤں گا۔ عجیب قصہ! اللہ اللہ کیا عظمت تھی اس شخص کی! مشتِ خاک تھا مگر دانشِ حاضر کا امام تھا۔"

میں اپنے کام کاج چھوڑ کے پہنچ گیا۔

حکیم صاحب نے کہا۔ "میرا خیال تھا کہ تم آسکو گے۔ کیسے چھوڑ دیا لوگوں نے تمھیں؟"

"دو تین آدمی بیٹھے تھے مگر مَیں ان سے معذرت کر کے آگیا ہوں۔ جب کاموں کا ہجوم ہو تو پھر میں یہ دیکھتا ہوں کہ زیادہ ضروری کون سا کام ہے؟"

"یہ زیادہ ضروری تھا؟"

"جی ہاں! آپ نے تو علامہ اقبال سے میری شیفتگی بڑھادی کسک میں کچھ اضافہ ہی کر دیا۔"

"اچھا تو سنو :-

قیام پاکستان سے پہلے، جب ہندوستان پر انگریز حکمران تھا تو اس کا قاعدہ یہ تھا کہ ریاستوں میں وزیر اعظم خود نامزد کیا کرتا تھا۔ نوابوں اور مہاراجوں کو اس امر کی اجازت نہ تھی کہ وہ اپنی مرضی سے کسی کو وزیر اعظم بنا سکتے۔ چنانچہ ریاست بہاولپور میں، جسے وزیر اعظم بنا کر بھیجا گیا تھا۔ وہ نواب صاحب کی منشا کے مطابق نہ تھا۔ آپس میں بنتی نہ تھی۔ ایک دوسرے کی ضد تھے۔ پہلے تو خود نواب صاحب وائسرائے بہادر کو لکھتے رہے کہ موجودہ وزیر اعظم سے میری جان چھڑائی جائے مگر شنوائی نہ ہوئی۔

مجبور ہو کر نواب صاحب نے سوچا کہ میری اس مشکل کو، اگر کوئی حل کر سکتا ہے تو وہ صرف ڈاکٹر اقبال، چنانچہ نواب صاحب کا آدمی علامہ کے پاس پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس معاملے کو بہ حیثیت بیرسٹر جانچا۔ حامی بھر لی۔ چار ہزار روپیہ مقدمے کی فیس طے پائی۔

ڈاکٹر صاحب وائسرائے کے پاس پہنچے۔ سیکرٹری کو اپنا کارڈ دیا۔ سیکرٹری نے کہا۔ قاعدہ یہ ہے کہ ہر ملاقاتی اپنا نام رجسٹر میں لکھتا ہے۔ رجسٹر

اندر جاتا ہے۔ جسے بلانا مقصود ہوتا ہے اُسے بُلا لیا جاتا ہے۔ لہٰذا آپ بھی کارڈ دینے کی بجائے رجسٹر میں اپنا نام لکھیں۔"

اس پر اقبالؒ نے کہا:"اگر وائسرائے میرے کارڈ پر مجھ سے ملنا نہ چاہیں گے تو میں واپس چلا جاؤں گا مگر عام لوگوں کی طرح رجسٹر میں نام نہ لکھوں گا۔"

مجبوراً سیکرٹری کو کارڈ ہی لے کر اندر جانا پڑا۔ وائسرائے نے کہا:"میں ان سے ملوں گا۔ انھیں بٹھایا جائے۔"

تھوڑی دیر کے بعد، وائسرائے ملاقاتیوں کے کمرے میں آئے۔ پوچھا "کیسے آئے؟"

"آپ نے ریاست بہاولپور میں جسے وزیر اعظم بنا کر بھیجا ہوا ہے۔ اُسے تبدیل کر دیں۔ اس لیے کہ اس کا برتاؤ نواب صاحب سے اچھا نہیں۔"

"ضابطے کے مطابق، نواب صاحب کو، اُس وزیر اعظم کو قبول کرنا چاہیے۔"

"کیا سیاست اسی کا نام ہے کہ آپ ایک فرمانروا کے معمولی سے مطالبے کو بھی نہیں مان سکتے؟ جب کہ نواب صاحب حکومتِ برطانیہ کا وفادار دوست ہے۔ پھر مسلمانوں میں اُس کی بڑی اہمیت ہے۔ اگر ایسی چھوٹی سی بات بھی نہ مانی گئی تو بڑا انتشار پھیلے گا۔ آپ کا اس میں کچھ حرج نہیں کہ کوئی دوسرا وزیر اعظم بنا دیں۔"

وائسرائے کو ایک تو علامہ اقبالؒ کے مرتبے کا علم تھا۔ دوسرے علامہ

نے بات بھی کچھ اس ڈھب سے کی تھی کہ وائسرائے کو انکار کرتے نہ بنی۔ کرنل صاحب اور اک ہو تو ایسا!

جب یہ بات طے ہوگئی تو وائسرائے نے کہا "اب آپ پرسوں میرے ساتھ کھانا کھائیں۔"

"مَیں تو آج واپس جا رہا ہوں۔"

"اچھا تو کل سہی!"

"مَیں تو آج ہی واپس جاؤں گا۔ کل تک نہیں ٹھہر سکتا۔"

"میری خواہش تھی کہ آپ کے ساتھ کھانا کھانے کی بھی خوشی حاصل کرتا۔"

"اگر یہ خواہش ہے تو آج کھانا کِھلا دیجیے۔"

حکیم صاحب نے اس واقعہ پر تبصرہ یوں کیا کہ یہ شان علاّمہ ہی کی تھی کہ وہ وائسرائے کی بات کو بھی رد کرنے یا اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی ہمّت رکھتے تھے۔ ورنہ کسی والئ ریاست تک کی مجال نہ تھی کہ وہ وائسرائے کے حکم کے خلاف زبان بھی کھول سکتا۔

حکیم صاحب نے بتایا کہ میں ایک دن ڈاکٹر صاحب کے ہاں بیٹھا ہُوا تھا۔ چودھری محمد حسین بھی موجود تھے۔ ایک تار آیا۔ چودھری صاحب نے وصول کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ "پڑھ کر سنا دیجیے۔"

چودھری صاحب نے بتایا۔ "تار نواب صاحب بہاولپور کی طرف

سے آیا ہے ۔ انھوں نے آپ کا شکریہ ادا کیا ہے ۔ یہ بھی لکھا ہے ۔ ملاقات کے لیے بہاولپور آئیے ۔"

ڈاکٹر صاحب ایک آدھ منٹ خاموش رہے ۔ اس کے بعد فرمایا —

نواب صاحب نے مجھے اپنا ملازم سمجھ لیا ہے ۔"

چودھری صاحب نے کہا ۔ "کیا جواب دے دوں نواب صاحب کو ؟"

"لکھ دیجیے ۔ مجھے فرصت نہیں ۔"

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ اس گفتگو کے بعد میں نے کسی دوسرے موقع پر چودھری صاحب سے اُس تار کا پس منظر پوچھا تھا تو انھوں نے مجھے وہ ساری تفصیل بتائی تھی ۔ جو میں نے آپ کو ابھی سنائی ہے ۔ بقول حکیم صاحب وہ موقع ایسا تھا کہ اگر ڈاکٹر صاحب نواب صاحب کے پاس پہنچ جاتے تو وہ انھیں دس پندرہ ہزار روپیہ ضرور دے دیتے ۔ مگر اس مردِ خود آگاہ کو خرید کون سکتا تھا!

حکیم صاحب نے یہ بھی بتایا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی مرضی کے مالک تھے ۔ انھیں کسی بات پر مجبور نہیں کیا جا سکتا تھا ۔ اس کے بعد انھوں نے علامہ کا ایک اور واقعہ بھی سنایا ۔

ہندوستان کے ایک نواب (شاید نواب جوناگڑھ) لاہور آئے ۔ سر عبدالقادر کے ہاں قیام کیا ۔ انھوں نے سر عبدالقادر سے کہا ۔ "میں دو کاموں کے لیے آیا ہوں ۔ ایک تو میں لاہور دیکھنا چاہتا ہوں ۔ دوسرے علامہ اقبال سے ان کا

کلام سننا چاہتا ہوں۔"

سر عبدالقادر جو علامہ کے گہرے دوست تھے۔ انھوں نے جواب دیا۔
"لاہور کی سیر تو میں بہ خوبی کرا دوں گا۔ مگر علامہ اقبال سے کلام سنوانا میرے بس کی بات نہیں۔ ہاں میں یہ کر سکتا ہوں کہ آپ کی خاطر دعوت کروں۔ علامہ کو بھی مدعو کروں، ہو سکتا ہے کہ کوئی ایسی صورت از خود پیدا ہو جائے کہ علامہ اپنا کلام سنا دیں ورنہ فرمایش کی جرأت نہ تو مجھ میں ہے اور نہ ہی کسی اور میں!"

اس پر حکیم صاحب نے تبصرہ فرمایا۔" ایک علامہ تھے کہ کوئی اُن سے فرمایش کر کے بھی کلام نہیں سُن سکتا تھا۔ ایک آج کے شاعر ہیں کہ اپنی بیاض بغل میں دبائے پھرتے ہیں۔ حیلے حوالے سے سامعین کو گھیرتے ہیں۔ پھر انھیں اپنا کلام سناتے ہیں اور اتنا سناتے ہیں کہ سننے والوں کو ادھ مُوا کر دیتے ہیں۔

حکیم صاحب نے اقبال کے بارے میں جتنی باتیں سنائیں، بڑے جذب کے ساتھ سنائیں۔ میں نے بھی انھیں اس لیے محفوظ کر لیا ہے کہ مجھے پھر کون ایسی باتیں سنائے گا۔ وہ بھی اتنے درد کے ساتھ! اتنی لذّتِ شوق کے ساتھ!

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ میں نے اقبال کے انتقال کی خبر بمبئی میں سنی تھی۔ اُن دنوں مجھے جس وقت بھی وہ حادثہ یاد آجاتا تھا تو میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے تھے۔ میں جتنے دن بھی وہاں رہا۔ روتا رہا۔ میرا بمبئی میں زیادہ دن رُکنے کا پروگرام نہ تھا۔ دانستہ رُکا۔ میں سوچتا تھا۔ جب میرا یہ حال

یہاں ہے تو لاہور جا کر کیا ہو گا۔ جہاں کہ اقبال کے بہت سے دوست ہیں۔ اقبال کا گھر ہے۔ اقبال کے بچے ہیں۔

ایک دن حکیم صاحب پھر ترنگ میں تھے۔ میں نے اُس موقع سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ اُن کی خدمت میں عرض کیا۔ "باہر بارش ہو رہی ہے سردی بھی ہے۔ لہٰذا کوئی گرم مگر دلچسپ قصہ سنائیں۔"

کہنے لگے۔ "میری زندگی میں بے شمار واقعات ایسے ہیں۔ جنھیں لوگ دلچسپ کہہ سکتے ہیں مگر اب میں وہ کیا سناؤں۔ اچھا نہیں لگتا۔ کچھ میری جوانی سے متعلق ہیں۔ کچھ میری افتادِ طبع کے متعلق، کچھ میری چودھراہٹ کے متعلق!"

"پھر بھی کچھ تو فرمائیے؟"

"بارش تو تیز ہو گئی۔ جلد تھمے گی بھی نہیں۔ دھاروں دھار ہے۔"

"جی ہاں!"

"اچھا تو پھر ایک لمبا قصہ سنو، بارش ختم جائے گی۔ یہ قصہ نہ تھمے گا۔"

"بسم اللہ!"

"کلکتے سے ایک ہفت روزہ اخبار نکلتا تھا۔ "چونچ" اس کا نام تھا۔ ایڈیٹر اس کے عنایت حسین تھے یا عنایت علی، بہرحال مجھے صحیح نام یاد نہیں رہا۔ آپ یہی سمجھیں کہ وہ عنایت صاحب تھے اور عنایت دہلوی کے نام سے لکھا کرتے تھے۔

عنایت صاحب کی مشہور اداکارہ کجن سے ٹھن گئی۔ عنایت صاحب کجن کے خلاف اپنے پرچے میں لکھا کرتے تھے۔ کجن نے تنگ آکر ان پر مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ جب بات بہت بڑھ گئی تو عنایت صاحب نے مجھے خط لکھا کہ کلکتے آئیے اور میرا اور کجن کا جھگڑا طے کرا دیجیے۔ کیونکہ کجن آپ کا کہا مانتی ہے۔ اس لیے یہ جھگڑا طے ہو سکتا ہے تو آپ ہی کے ذریعے!

مَیں عموماً دلی جایا کرتا تھا۔ سوچا اب کے کلکتے تک ہو آؤں۔ میرا ایک ڈراما بھی عبدالرشید کاردار کے پاس تھا۔ جو اُن دنوں کلکتے میں تھے۔ کسی فلم کمپنی میں بہ طور ڈائرکٹر، میرے ڈرامے کا نام تھا "نور بانو"! کاردار نے بھی لکھا ہوا تھا کہ یہاں آجائیے تاکہ معاملہ طے ہو جائے۔ یہ ساری باتیں سوچ کر مَیں نے کلکتے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سوچا ایک پنتھ دو کاج!

عنایت صاحب کو تار دیا۔ کلکتے پہنچ رہا ہوں۔ فلاں تاریخ کو اسٹیشن پر ملو۔ پہنچا تو عنایت صاحب اسٹیشن پر موجود تھے۔ بڑی گرمجوشی سے ملے۔ سامان اٹھایا۔ لینڈو میں رکھوایا۔ چل دیے۔ ٹخ ٹخ ٹخ!

بجائے اس کے کہ مجھے اپنے گھر لے کے جاتے۔ انھوں نے ستم ظریفی یہ کی کہ مجھے بغیر بتائے سیدھا آغا حشر کے مکان پر لے گئے۔

اندر جا کر آغا صاحب سے کہا۔ "میں آپ کے لیے ایک شاندار مہمان لایا ہوں۔"

آغا صاحب سمجھے کسی دلرُبا کو لائے ہوں گے۔ آنکھ مار کر پوچھا۔

"کسے لائے ؟"

"حکیم یوسف حسن کو !"

"اچھا میں کچھ اور سمجھا تھا۔ مگر حکیم صاحب بھی کسی معشوق سے کم نہیں۔ تم نے بڑا اچھا کیا جو انھیں یہاں لے آئے۔"

واپس جا کر عنایت صاحب نے مجھے کہا۔ "میں آپ کو اپنے مکان سے اچھے مکان میں لایا ہوں اور یہ مکان آغا حشر کا ہے۔"

"آغا حشر کا ؟"

"جی ہاں !"

اتنے میں آغا صاحب باہر تشریف لے آئے۔ میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو انھوں نے ہاتھ جھٹک کر بڑی گرمجوشی سے معانقہ کیا۔ اور پھر میرے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے اندر لے گئے۔ صوفے پر بیٹھے تو آغا صاحب نے پھر عنایت صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔ "عنایت صاحب میں آپ کا یہ احسان عمر بھر نہ بھولوں گا۔"

میں نے سوچا۔ اب حکیم صاحب مجھے یہ بتا کر خاموش ہو جائیں گے کہ میں نے قیامِ کلکتہ میں جہاں آرا کجن کی عنایت صاحب سے صلح کرا دی تھی اور واپس چلا آیا تھا۔ اسی خطرے کے پیشِ نظر میں نے حکیم صاحب سے کہا

"ذرا آغا حشر سے بھی ملاقات کرا دیں۔"

"یہ ایک الگ مضمون ہے۔"

"ارے صاحب الگ ہے تو ہُوا کرے۔ ہم یہاں کونسی تاریخ ادب اُردو لکھ رہے ہیں۔ جس میں خطرہ ہو کہ ایک شخصیت، دوسرے میں مدغم نہ ہو جائے۔ باتیں ہی تو ہو رہی ہیں۔ میری معلومات کے لیے بتائیے نا کچھ!"

"اچھا تو سنو، عنایت صاحب کے معاملے کو پھر پکڑ لیں گے۔"

آغا صاحب کا منشی ہندو تھا۔ یہ ڈراما بولتے تھے۔ وہ لکھتا تھا۔ ایسے سمے آغا صاحب کا حلیہ یہ ہوتا تھا کہ وہ صرف بنیان اور تہہ بند باندھے ہُوئے ہوتے تھے۔ ریشمی اور قیمتی تہہ بند،

روز لکھواتے نہ تھے مگر جب لکھوانے پر آتے تھے تو الفاظ آبشار کی طرح گرتے تھے۔ چند دنوں میں ڈراما مکمل ہو جاتا تھا۔

قاعدہ یہ تھا کہ صبح آٹھ نو بجے کے قریب، خوب پیٹ بھر کے ناشتہ کرتے تھے۔ سارا دن فلم کمپنیوں کے چکر لگایا کرتے تھے۔ کبھی کسی کے ہاں پہنچے، کبھی کسی کے ہاں! کسی سے مذاق، کسی سے معاملے کی باتیں، کسی سے گالی گلوج، کسی سے راز و نیاز، غرض یونہی دن گزارا کرتے تھے۔ چار بجے باہر ہی چائے پی لیتے تھے۔ رات کو گھر آ کر کھانا کھاتے تھے۔

ایک دن میں اپنے ڈرامے کی معاملت کے لیے نکل گیا۔ کاردار سے

ملے۔ انھوں نے سیٹھ سے ملایا۔ سیٹھ نے ہنس راج ڈائرکٹر سے ملنے کے لیے کہا۔ ہنس راج سے ملا تو اُس نے سیٹھ صاحب سے جاکر کہا۔ "ڈراما اچھا ہے معاملہ طے کر لیجیے۔ سیٹھ صاحب نے مجھے پانچ سو روپے دیے اور کہا۔ "فلم بن جانے پر اپنی خوشی سے اور بھی دیں گے۔"

جب میں نے یہ بات آغا صاحب کو آکر بتائی تو وہ بڑے ناراض ہُوئے۔ کہنے لگے "صرف پانچ سو روپے لائے ہو۔ اگر مجھے بتا دیتے تو میں تمھیں اسی ڈراما کے پانچ ہزار روپے دلواتا۔"

آغا صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہُوا تو میں نے ان سے کہا "میں نجمن سے ملنا چاہتا ہوں۔ نجمن کی ماں سے اوائل عمر میں آغا صاحب کے تعلقات رہے تھے۔ اس لیے میری بات سُن کر چونکے مگر مجھے وہاں جانے سے منع نہ کیا۔ کہا۔ "آپ نجمن کے ہاں نہ جائیں۔ اُسے یہاں بلا لیں گے یہیں بات ہو جائے گی۔"

میں نے کہا۔ "مجھے تو کوئی کام نہیں۔ چو نچ والے عنایت صاحب کا کام ہے۔" اس پر آغا صاحب نے بیزاری کے لہجے میں کہا۔ "دیکھا جائے گا۔"

آغا صاحب نے اندازہ لگایا کہ میں نجمن سے تفریحاً بھی ملنا چاہتا ہوں اس لیے وہ مجھے شام کو اپنی محبوبہ مختار بیگم کے ہاں لے گئے۔ آغا صاحب نے رات کا کھانا وہیں کھلایا۔ تعارف بھی کرایا۔

دوسرے دن گجن کو پیغام بھجوایا۔ اُس نے دوپہر کے کھانے پر بلایا۔ کھانے کے سلسلے میں بے حد اہتمام کیا ہُوا تھا۔ تیس پینتیس کھانے، چکھتے چکھتے ہی پیٹ بھر گیا۔ کیا امارت تھی ان لوگوں کی اور کیا ٹھاٹھ تھے ان کے، بڑے بڑے راجہ مہاراجہ بھی، ان کے سامنے دم نہیں مار سکتے تھے۔

کھانے کے بعد گجن نے کہا۔ "آیئے آپ کو کلکتے کی سیر کرا دوں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی بڑی شان دار کار نکلوائی۔ خوب گھومے، خوب سیر کی، باغات بازار، سیرگاہیں سب دیکھیں۔ ایک جگہ پٹرول ختم ہو گیا۔ پٹرول پمپ سے پٹرول لیا۔ بجائے رقم دینے کے، گجن نے بل پر دستخط کر دیئے۔

مَیں نے کہا۔ "روپے دے دیتیں۔ دستخط کیوں کیے؟"

کہنے لگیں "کلکتہ کے سارے لوگ مجھے جانتے ہیں۔ وہ اس بات پر خوش ہوتے ہیں کہ ظاہر کریں کہ ہمارا واسطہ گجن سے بھی ہے۔ ان کی خوشی کی ایک شکل یہ بھی ہے۔"

چار بجے کے قریب کلکتے کے ایک شان دار ہوٹل میں چائے پلائی۔ کلکتے سے رخصت ہوتے وقت، قیمتی تحائف دیے۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد، حکیم صاحب گجن کے تصور میں گم ہو گئے۔ میں نے ٹھوکا دیا۔ "حضرت کہاں ہیں؟"

"تُو بھی عجیب بدمعاش ہے۔ خواہ مخواہ ہمارے زخموں کو کریدتا ہے۔"

"زخم کھایا تھا کوئی؟"

"نہیں یہ بات نہیں" یہ کہہ کر پھر کھو گئے۔

میں تاڑ گیا کہ اب ان سے کوئی بات کرنا مغز پچی کرنے کے برابر ہوگا۔ لہٰذا چائے کا آرڈر دیا۔ چائے پی۔ بال بچوں کی خیریت پوچھی۔ پنڈی کے موسم کی بات کی۔ ہاں یہ بتانا تو شاید میں بھول ہی گیا کہ مجھ سے حکیم صاحب کی ملاقات ماہانہ ہے۔ یہ راولپنڈی سے ہر ماہ دو چار دن کے لیے لاہور آیا کرتے ہیں۔ میرے ہاں بھی التزاماً تشریف لاتے ہیں۔

اتنے میں دیکھا کہ حکیم صاحب پھر موڈ میں آ گئے۔ بارش بھی ابھی تھمی نہ تھی۔ لیکن ہلکی ضرور ہو گئی تھی۔ چنانچہ یہ بھی آہستہ آہستہ کہنے لگے۔ "گجن مجھ پر بڑا اعتماد کرتی تھی۔ وہ اپنے سارے معاملات میں بذریعہ خط و کتابت مجھ سے مشورے کیا کرتی تھی۔ ایک دن اس نے مجھے لکھا کہ میں نے نوکری چھوڑ دی ہے۔ اپنا تھیٹر بنانا چاہتی ہوں۔ مجھے بتائیے کہ میں کیا کیا کروں؟ اور یہ بھی لکھا کہ میں آپ کے بنائے ہوئے پروگرام پر عمل کروں گی۔"

حکیم صاحب نے کہا۔ "یہ اس کی عنایت تھی کہ اُس نے مجھ سے یہ سب کچھ پوچھا۔ ورنہ کلکتے میں اس فن کے بڑے بڑے ماہر موجود تھے۔

میں نے گجن کو لکھا کہ تھیٹر کے پرانے طریقے کو ختم کیا جائے۔

۱؎ تھیٹر کے سلسلے میں حکیم صاحب کی معلومات وسیع ہیں۔ افسوس کہ ان سے کوئی کام نہیں لیا گیا۔ ورنہ جوہر اس میدان میں دکھا سکتے۔ کل دو تین ہی تو آدمی ہیں۔ جو اس کا بہت کچھ جانتے ہیں۔ ایک حکیم احمد شجاع، دوسرے امتیاز علی تاج اور تیسرے یہ!

اُن دنوں ایک دن میں ایک شو ہوتا تھا۔ مَیں نے لکھا۔ ایک دن میں دو شو ہونے چاہئیں۔ مَیں نے تجویز کیا کہ پہلا شو ساڑھے تین بجے شروع ہو کر نو بجے ختم ہو، دوسرا شو دس بجے شروع ہو کر ڈیڑھ بجے ختم ہو۔ جب کجن نے اس تجویز کو دوسرے لوگوں کے سامنے رکھا تو سب نے مخالفت کی۔ ایک آدمی ایسا نہ تھا۔ جس نے میری رائے کی تائید کی ہو۔ سب یہی کہتے تھے۔ تباہ ہو جاؤ گے۔ لیکن کجن نے جواب دیا۔ مَیں وہی کروں گا جس کا مشورہ حکیم صاحب نے دیا ہے۔ اس لیے کہ میرا ایمان ہے کہ وہ مجھے غلط مشورہ نہیں دے سکتے۔

جب یہ طے ہو گیا کہ ایک دن میں دو شو ہوں گے تو مَیں نے ڈراموں کے غیر ضروری حصّوں کو حذف کر کے انھیں مختصر کر دیا۔ اس سے یہ ہُوا کہ ڈراموں میں اور زور پیدا ہو گیا۔ نئے ڈرامے بھی اسی نہج پر لکھوائے۔ چنانچہ تھیٹریکل کمپنی نے بنارس، لاہور، امرتسر، ملتان، سکھر اور حیدر آباد میں اپنے ڈرامے کھیلے۔ جو بے حد کامیاب ہوئے۔ لاکھوں روپیہ کمایا۔ لاکھوں لاکھ!

لاہور میں اس تھیٹریکل کمپنی کا قیام چار پانچ مہینے رہا۔ ایک دھوم مچی ہُوئی تھی۔ کمپنی کی مقبولیت پر مَیں خوش ہُوا کرتا تھا۔

جس دن کجن اپنی کمپنی کو لے کر لاہور پہنچی تھی۔ اس دن لاہور ریلوے اسٹیشن پر اتنی پبلک تھی کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ چنانچہ ہم کجن کو پچھلی طرف

سے لے کر نکلے - ورنہ وہ کچل جاتی - مر جاتی !

یہاں سے حکیم صاحب نے پھر رُخ بدلا - پھریری لی - انھیں پھر آغا حشر نے دبوچ لیا - ذہنی طور پر میں چاہتا تھا کہ وہ گجن کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہتے ہیں - یہیں کہہ دیں مگر میں نے ٹوکنا بھی مناسب نہ سمجھا - ڈرتا تھا - کہیں سلسلہ منقطع نہ ہو جائے - حکیم صاحب تھک چکے تھے - میں ڈر رہا تھا - ویسے جہاں تک میرا خیال ہے مجھے تو یہ "ڈبل ٹریک" سلسلہ پسند ہے -

انھوں نے کہا -

آغا حشر سے تھیٹروں اور ڈراموں پر اکثر بات چیت ہوتی تھی - ایک رات میں سویا ہُوا تھا - مجھے سوتے سے جگایا - کوئی بارہ بجے کا وقت ہو گا - اُسی وقت باہر سے آئے تھے - میرے سامنے پانچ ہزار کے نوٹ ڈھیر کر دیے - کہا " ابھی ساہے سیٹھ سے معاہدہ کر کے آیا ہوں - "

میں نے کہا " پانچ ہزار ؟ "

" یہ تو پیشگی ہیں - جب ایک سین لکھ لوں گا تو اتنے ہی روپے اور لوں گا - جب فلم مکمل ہو گی تو سیٹھ مجھے پندرہ بیس ہزار سے زیادہ دے چکا ہو گا "

پھر کہنے لگے " آغا صاحب کی مالکان تھیٹر پر اتنی مضبوط گرفت تھی کہ اس کی مثال نہیں ملتی - جو چاہتے تھے - منوا لیتے تھے - یہ سیٹھوں کو دھکے دیتے تھے - مگر وہ ڈراما آغا حشر ہی کا حاصل کرتے تھے -

ایک تھیٹریکل کمپنی کے مالک نے ان سے از رہِ مذاق یہ کہہ دیا۔
"آغا صاحب! آپ کو اپنے ڈرامے پر ناز ہے۔ ہمیں اپنے روپے پر ناز ہے
اگر ہم ایک ناٹک پر دو تین لاکھ روپیہ صرف نہ کریں تو اتنی آمدنی نہیں ہو سکتی۔
یہ ہمارا روپیہ ہے جو روپے کو کھینچتا ہے اور آپ کے ڈرامے قبولیت
پاتے ہیں۔

آغا صاحب نے غصے میں آکر کہا۔ "تمھاری بہن کی . . . . . آپ بکواس
کر رہے ہیں۔ جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ میرا ڈراما ہی ہے جس کی وجہ سے خلقت
کھنچی چلی آتی ہے اور آپ کی تجوریاں بھر رہی ہیں۔

انھوں نے کہا۔ "اب میں ایک ایسا ڈراما لکھوں گا، جس میں آپ کا
کچھ خرچ نہ آئے گا مگر اس کی آمدنی پہلے ڈراموں سے زیادہ ہوگی۔"

آغا صاحب اُسی وقت غصے میں اُٹھ کر وہاں سے چلے آئے۔ رات
کو ڈراما لکھوانا شروع کر دیا۔ اُس ڈرامے کا نام تھا "دھرمی بالک" یہ کھیل ایک
یتیم خانے سے شروع ہوتا تھا۔ جہاں چند یتیم بچے پڑھتے تھے۔ جن کے کھدر کے
کپڑے تھے، کھدر کی ٹوپیاں اور معمولی چپلیں!

نہ اسٹیج پر محل بنے، نہ بھڑکدار لباس کی ضرورت پڑی۔ نہ طمطراق کی
ضرورت تھی نہ شان و شوکت کی مگر پبلک کی پسندیدگی کا یہ عالم رہا کہ وہ کھیل
کلکتہ کی اسٹیج پر تین سال تک مسلسل کھیلا گیا اور اس کی آمدنی پہلے کھیلوں کے

مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔

اسی طرح آغا صاحب کی تکرار چند مشہور ایکٹروں اور ایکٹرسوں سے ہو گئی۔ انھوں نے کہا۔ یہ سب کچھ ہم کرتے ہیں تو مقبولیت آپ کو ہوتی ہے۔ اگر ہم اتنی جان نہ ماریں۔ اتنی محنت نہ کریں تو آپ کو کوئی بھی نہ پوچھے۔

آغا صاحب نے حسبِ معمول سب کو ماں بہن کی گالیاں دیں اور کہا "آیندہ جو ڈراما لکھوں گا۔ اُس میں نہ کوئی ڈائرکٹر ہو گا۔ نہ ہیرو، نہ ہیروئن، صرف پردے اُٹھانے والے قُلی ہوں گے۔"

چنانچہ لوگوں نے دیکھا کہ آغا صاحب نے جو بات کہی تھی وہ سچ بھی کر دکھائی ایک ایسا ڈراما بھی لکھ مارا جس میں بڑے ایکٹروں کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ وہ کھیل بھی حسبِ معمول مقبول ہُوا۔ خوب آمدنی ہُوئی۔

حکیم صاحب کہتے ہیں کہ تھیٹر کی دنیا میں آغا صاحب ہی سب کچھ تھے۔ وہ جو چاہتے تھے۔ اُس میدان میں کر کے دکھا دیتے تھے۔

پھر حکیم صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ مَیں اُن دنوں کلکتہ میں کوئی آٹھ روز رہا۔ میں نے آغا صاحب کو خوئے دلنوازی میں یکتا، بیحد ملنسار اور خوش گفتار پایا۔ اس کے ساتھ بے حد عالم!

میں نے سوچا، حکیم صاحب آج کی گفتگو کے آخری نکتے پر پہنچ گئے ہیں۔ لہٰذا پوچھا۔ حکیم صاحب باتیں بہت ہُوئیں۔ میری معلومات میں اضافہ بھی ہُوا،

مگر اُس عزیب چوپٹ کے ایڈیٹر کا کیا بنا؟"

"بچن کو سمجھا دیا تھا۔ اس نے مقدمہ واپس لے لیا تھا"

رہبی قصّہ تو ایڈیٹر چوپٹ کا تھا مگر بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ مَیں نے تو ان باتوں سے لطف اٹھایا۔ معلومات بھی حاصل ہُوئیں۔ حکیم صاحب بھی کھُلے مگر اس کے باوجود میں نے "یکم مزید" والی عادت کو ترک نہ کیا۔ مجھ ایسا بندہ گستاخ بھی کوئی نہ ہو پوچھ ہی لیا :۔

"حکیم صاحب ہم تو آپ کے بارے میں یہی جانتے تھے کہ آپ ادبی میدان کے سرخیل ہیں، مگر یہ ایکٹرسوں سے دوستی کا راز آج ہی کھُلا۔

"میرے تعلقات صرف بچن ہی سے نہ تھے۔ بلکہ سردار اختر، خورشید اور زہرہ سے بھی تھے۔"

میں نے سوچا" لو بھئی یہ معاملہ تو بہت دور تک چلا گیا۔ جبھی تو میں نے حیرت سے کہا ۔۔ "سبحان اللہ!"

حکیم صاحب نے کہا۔" یہاں سبحان اللہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ان عورتوں سے بڑے تعلقات تھے۔ اتنے تعلقات کہ جتنا جھوٹ بولا جا سکے مگر میرے تعلقات، ان سے شائستہ تھے۔ بازاری عورتوں والے نہ تھے۔ میں نے اپنے آپ کو بچایا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں ان جھمیلوں میں اٹک گیا تو پھر میری ہڈیاں بھی نہ بچیں گی۔ یوں میں نیرنگِ خیال کی وجہ سے سوچتا تھا۔

رسالے نے مجھے بڑا نقصان پہنچایا مگر اس کے تقاضوں نے مجھے ایسی آلائشوں سے بچایا بھی!

پھر حکیم صاحب نے یہ بھی بتایا کہ جن دنوں گجن، لاہور میں تھیٹر کے آئی ہوئی تھی۔ میں ہر روز تھیٹر جایا کرتا تھا۔ تھیٹر کے مینجر نے گجن کی ماں سے کہا۔ "حکیم صاحب روز آتے ہیں۔ گجن بھی حکیم صاحب کا بڑا خیال رکھتی ہے کہیں معاملہ گڑبڑ نہ ہو جائے" اس پر گجن کی ماں نے کہا تھا:

"ہم آدمی کی آنکھ پہچانتے ہیں۔ اس لیے ہمیں حکیم صاحب سے کوئی خطرہ نہیں۔"

باتیں کرتے کرتے شام ہو چلی تھی۔ بارش بھی تھم چکی تھی۔ حکیم صاحب نے کہا۔ "آج گھر جانے کا ارادہ نہیں؟"

"کیوں نہیں؟"

"پھر چلیے"

راستے میں پھر باتیں شروع ہو گئیں۔ میں نے پوچھا۔ گجن سے واقفیت کیسے ہوئی تھی؟"

کہنے لگے "گجن علم دوست تھی۔ مطالعہ تھا۔ نیرنگِ خیال کی خریدار تھی۔ خط و کتابت میں دوستی ہو گئی۔ ہمارے رسالے کا سالانہ چندہ پانچ روپے تھا۔ مگر وہ پچاس روپے بھیجا کرتی تھی۔"

پھر انھوں نے یہ بھی بتایا کہ گجن کی والدہ آغا حشر کی محبوبہ تھی۔ بہار کی رہنے والی تھی۔ جو گجن سے زیادہ خوبصورت تھی۔

پھر حکیم صاحب نے آہ بھری، کہنے لگے۔ گجن بے شک ایکٹرس تھی۔ مگر دل و دماغ بڑا خوبصورت پایا تھا۔ اس نے لکھنؤ کے ایک نواب سے شادی کی۔ جس کی آرزو خود نواب صاحب کو تھی۔ گجن نے بھی یہ سوچ کر شادی کی کہ اچھی زندگی گزارنے کے لیے یہی راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ مگر نواب جو شریف زادہ تھا۔ ایک ایکٹرس کو دھوکا دے گیا۔ مگر ایکٹرس نے جو کچھ نواب صاحب کے لیے کیا۔ وہ شریف زادی سے شریف زادی بھی نہیں کر سکتی۔ بہر حال چھوڑیے اس قصّے کو، اس معاشرے میں اچھا کون ہے اور بُرا کون، اس کا فیصلہ خاندانی شرافت یا اُجلے لباس سے نہیں کیا جا سکتا۔

حکیم صاحب معمّر ہیں مگر ان کا جوش و ولولہ نوجوانوں سے کم نہیں۔ جن دنوں ہند و پاک لڑائی چھڑی ہوئی تھی۔ اُن دنوں بھی یہ اپنے پروگرام کے مطابق پنڈی سے لاہور آتے رہے۔ کچھ لوگ لاہور سے پنڈی جا رہے تھے مگر یہ پنڈی سے لاہور آتے رہے۔

کوئی آ کے کہتا۔ "ہماری فوج فلاں محاذ پر آگے بڑھ گئی ہے۔ کوئی کہتا فلاں محاذ پر، یہ کہتے تم لوگ یہ کیوں کہتے ہو کہ فلاں محاذ پر بڑھی، فلاں محاذ پہ بڑھی۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ ہر محاذ پر بڑھی۔"

ساتھ ہی پورے جوش کے ساتھ، ہندو ہمیں میدانِ جنگ میں شکست نہ دے گا۔ شکست جب دے گا۔ میز پر بیٹھ کر دے گا۔"

پاکستان کی فارن پالیسی پر یہ ہمیشہ خوش ہوئے۔ ان کے منہ سے اکثر سننے میں آیا فلاں بیرونی مسئلے پر وہ مارا، فلاں مسئلے پر وہ مارا؛ یعنی ہندوستان کی سیاسی چالوں کو بے نقاب کر دیا۔ ناصر نے پاکستان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے۔ عربوں کے دل جیت لیے۔ روس کو ہمنوا بنا لیا۔ وغیرہ وغیرہ!

یہ صدر ایوب کے بڑے زبردست حامی ہیں[1]۔ اگر کوئی کہے کہ صدر نے یہ کام اچھا نہیں کیا یا یہ کہ صدر کے فلاں رشتہ دار نے یہ کیا تو یہ فوراً اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ "تمھیں کیا معلوم؟ ساری سنی سنائی باتیں سچّی نہیں ہوتیں۔ پھر یہ دلیل بھی، اگر یہ سب کچھ کیا بھی ہو تو ٹھیک ہے۔ اُس نے ہمیں موت کے منہ سے چھینا ہے۔ آئے دن کا سیاسی تماشا ختم ہُوا۔ دُنیا میں ہماری عزّت تو بنی وغیرہ وغیرہ!

ایک دن کہنے لگے۔ "ایک تو ہمارے ہاں اناج کی قلّت ہے۔ دوسرے ہم لوگ خود بڑے نالائق ہیں۔ چونکہ اسراف ہماری گھُٹی میں پڑ چکا ہے۔ اس لیے یہ مسئلہ قیامت تک حل نہ ہو گا۔

"وجہ؟"

"وجہ یہ کہ ہر گھر میں روزانہ ہی ایک ایک دو دو روٹیاں بچ رہتی ہیں۔"

[1] یہ مضمون ۱۹۶۸ء میں لکھا گیا تھا۔

بعض حالتوں میں تین تین چار چار، یہ بے تدبیری ہے۔ اگر ہم لوگ آج یہ طے کرلیں کہ اناج ضائع نہ ہونے دیں گے تو ہم کم از کم بھی سال بھر میں، تین مہینے کا تو اناج بچا ہی سکتے ہیں۔ اب ہمیں جتنا تو جینے کے لیے اناج درکار ہے۔ وہ اصل میں سال بھر کے لیے کافی ہے۔"

"آپ نے حساب لگایا ہے کیا؟"

"ہاں ہاں!"

"آپ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی سوچتے ہیں؟"

"یہ بات چھوٹی تو نہیں۔ اگر آپ حساب کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم ہر سال کھربوں روٹیاں ضائع کر دیتے ہیں۔"

"کھربوں کیا؟"

"بھئی ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں، اربوں کے بعد جو کھربوں ہوتا ہے وہ!"

حکیم صاحب کی دو بیویاں ہیں۔ دونوں سے ان کے تعلقات نہایت خوشگوار ہیں۔ ایک پنڈی میں رہتی ہیں۔ ایک لاہور میں، بڑی بیگم پنڈی میں رہتی ہیں۔ چھوٹی لاہور میں، آج کل خود حکیم صاحب پنڈی میں رہتے ہیں۔ بڑی بیگم کے پاس۔ "اصولاً" تو انھیں چھوٹی بیگم کے پاس رہنا چاہیے، مگر یہ ایسا نہیں کرتے۔ چونکہ ان کی ہر ادا معقولیت کے ساتھ لگا کھاتی ہے۔

لہذا ہوگی اس میں بھی کوئی حکمت!

لاہور والی چھوٹی بیگم کو روزانہ ایک خط لکھتے ہیں اور ہر ماہ کی پہلی تاریخوں میں لاہور کا ایک چکر بھی لگا لیتے ہیں۔ مقررہ تاریخ پر خرچ دونوں کو دیتے ہیں۔ غرض ان کے اس لین دین میں بھی ایک باضابطگی ہے۔ جس میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یوں نہ کرتے تو خوشیاں ان کی دشمن بن جاتیں۔

میں نے پوچھا۔ "دونوں آپس میں لڑتی نہیں ہیں؟"

اول تو اکٹھی کم ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی یوں ہُوا بھی تو میں نے ان کے جھگڑوں میں دخل نہیں دیا۔ دونوں ہی خود بخود ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ اس سلسلے میں میں احتیاط یہ برتتا ہوں کہ ان کے معاملات میں خاموش رہتا ہوں۔ جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ میں چُپ بیٹھا رہتا ہوں۔ سچی کو سچی اور جھوٹی کو جھوٹی نہیں کہتا۔ میرے ان سے خوشگوار تعلقات[۱] کا راز یہی ہے۔

ایک دن بڑی لمبی سرد آہ کھینچی۔ کہا۔ "مجھے ادب نے بڑا نقصان پہنچایا۔ اگر یہ لت مجھے نہ پڑتی تو آج میرا ہمدرد دواخانہ کے بعد سب سے بڑا دواخانہ ہوتا۔"

میں نے کہا۔ "اگر آپ ادب میں نہ پڑتے تو آپ لاکھوں روپوں کے مالک ضرور ہوتے مگر آپ کی یہ عزت نہ ہوتی جو آج ہے۔ اور پھر یہ کہ

---

[۱] اب تو ان میں سے بڑی بیگم اللہ کو پیاری ہو گئی ہیں۔ (۱۹ اپریل ۱۹۶۷ء) نازش رضوی نے تاریخ وفات کہی، گل ہو گیا ہے چراغ خانہ
۱۹۶۷ء

آپ کے ادبی کارنامے تو آپ کو مدتوں زندہ رکھیں گے۔ جب تک اُردو ہے۔"

"میں اس غلط فہمی میں مبتلا نہیں۔"

"مایوسی کی وجہ؟"

"آپ نے اپنے بارے میں جو مضمون لکھا تھا۔ وہ بالکل صحیح ہے کہ زندہ رہے تو ادب کی خاطر ہزاروں قربانیاں دیں۔ آسائشیں تج دیں۔ روپے پیسے نچھاور کیے۔ مر گئے تو ایک فقرہ حصے میں آیا کہ ——"مرحوم نے اپنے زمانے میں بڑا کام کیا تھا۔ اچھے اچھے نمبر نکالے۔" کیا یہ فقرہ ہماری تمام اذیتوں اور تمام جانکاہیوں کا انعام ہو سکتا ہے؟"

"جواب دو!"

میں جواب کیا دیتا۔

اتنی ہنگامہ آفریں شخصیت کہ جس کا ہر لمحہ اپنے تشخص کے اظہار کے لیے ہی ہو۔ وہ اس حد تک علیحدگی پسند اور قناعت پسند بھی ہو گا؟ بات سمجھ میں نہیں آتی۔ بہ ظاہر یہ کرشمے عمر کے ہیں۔ جو سب کے بل نکال ڈالتی ہے۔ مگر یہ بھی اُسی صورت میں ممکن ہے کہ سرشت میں کجی نہ ہو۔ بہ ہر حال اب تو ان کی خاموشی، کنارہ کشی اور صبر و سکون ہی ان کی زندگی کے زیور ہیں۔

ایک دن حکیم صاحب میرے پاس تشریف لائے تو پسینے میں شرابور تھے۔ انتہا درجے کی گرمی تھی۔ اس پہ مستزاد، شیروانی پہنے ہوئے تھے اور بٹن

بھی سارے بند!

مَیں نے کہا۔" اتنی گرمی میں، آخر اس شروانی کی کیا ضرورت تھی؟"

" ضرورت تھی۔"

" آخر کیوں؟"

" اگر میں اس وقت شیروانی پہنے ہُوئے نہ ہوتا تو مجھے پچاس روپے نہیں مل سکتے تھے۔"

" وہ کیسے؟"

" میں اس وقت ایک مریض دیکھ کر آ رہا ہوں۔ اُس نے مجھ سے فیس پوچھی، میں نے پچاس روپے کہہ دیے اگر شیروانی پہنے ہُوئے نہ ہوتا تو وہ مجھے بیس روپے بھی نہ دیتا۔"

" ایسے سہاروں پر یقین نہ رکھیں۔ اگر آپ میں کوئی جوہر ہے تو وہ قیمت دلوائے گا۔ کپڑوں سے کیا ہوتا ہے۔"

" مَیں مہاتما گاندھی نہیں ہوں کہ لنگوٹی باندھ کر بھی ــــ"

" بہرحال قیمت اپنی دلوایے۔ کپڑوں کی نہیں۔"

تم نے شیخ سعدیؒ کی حکایت پڑھی ہوگی۔ وہ ایک دعوت میں اپنے روزمرہ کے لباس میں چلے گئے تھے۔ ہئیت دیکھی تو دربان نے اندر جانے

نہ دیا۔ چنانچہ وہ واپس ہوئے۔ دوبارہ اچھے کپڑے پہن کے گئے تو کسی نے نہ روکا، کھانے پر بیٹھے تو شیخ سعدی کپڑوں کو کھانے میں بھگونے لگے۔ لوگوں نے پوچھا۔ حضرت یہ کیا؟ کہنے لگے یہ دعوت تو کپڑوں کی ہے۔ میری تھوڑی ہے"

"حکیم صاحب یہ حکایت تو میں نے سُن رکھی تھی۔ پھر آپ نے پوری تفصیل سے کیوں دہرائی؟"

"اس لیے کہ تمھارے خیالات قابلِ اصلاح ہیں۔ اس چکر میں پڑے رہے تو پیچھے رہ جاؤ گے۔ فوراً ایک موٹر خریدو، ہر مہینے ایک دو سوٹ بنواؤ جتنی زیادہ ٹیپ ٹاپ میں رہو گے لوگ اتنی زیادہ قدر کریں گے۔ کام کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ صرف باتیں کرنے کا فن سیکھو پھر دیکھو تم کہاں سے کہاں پہنچتے ہو"

"میں جہاں ہوں۔ وہیں ٹھیک ہوں"

"میں بھی یہی سوچا کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج رو رہا ہوں"

میں نے سوچا یہ تو بڑی اُونچی ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔ قناعت کے بھی دعوے دار ہیں۔ حالانکہ اوروں کی طرح، انھوں نے بھی ہر موقع سے فائدہ اٹھایا ہو گا۔ سوال سُوجھا، شیطان نے بھی وسوسے کو تقویت بہم پہنچائی۔

"آپ نے ایک دفعہ حیدر آباد (دکن) کے بارے میں بھی تو ایک نمبر چھاپا تھا جس میں نہ صرف نواب صاحب کے بڑے بڑے فوٹو چھاپے تھے بلکہ شہزادوں اور شہزادیوں تک کے فوٹو چھاپے تھے۔ اور پھر وہاں کے

رؤسا اور امرا کے بھی تو حالات زندگی چھاپے تھے۔"

"ہاں چھاپے تھے۔"

"پھر؟"

"پھر کیا؟"

"نواب صاحب تو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے اہلِ علم کی خدمت کیا کرتے تھے۔ ضرور آپ کو بھی نوازا ہوگا۔ جبکہ آپ نے ان کے بارے میں نمبر بھی چھاپا ہو۔"

"مَیں نے اپنی عادت کے مطابق، نواب صاحب سے کسی قسم کی درخواست کرنی پسند نہیں کی تھی۔"

"خود نواب صاحب نے بھی خیال نہ رکھا؟"

"رکھا تھا۔"

"کیا؟"

"میرے پاس ایک خط آیا تھا، جس میں لکھا تھا کہ شاہی فرمان جاری ہوا ہے، جس کے مطابق آپ کی خدمت میں سوا چار روپے بہ طور سالانہ چندہ ارسال کیے جا رہے ہیں۔"

انسان کتنا گھٹیا ہے اور کتنا اعلیٰ، اس کے پرکھنے کے معیار اور بھی ہوں گے۔ میرے نزدیک ایک معیار یہ بھی ہے کہ اُسے روپے پیسے کے

لین دین کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ اس معیار پر بڑے بڑے کھرے سکے
اُترتے دیکھے گئے ہیں۔

اپنی حکیم صاحب سے نیاز مندی بھی ہے۔ روپے پیسے کا لین دین
بھی ہے مجھے تو حکیم صاحب نے اس کا موقع نہیں دیا کہ میں اس ضمن میں
ان سے کوئی شکایت کر سکتا۔ اُنھیں ہی مجھ سے کوئی شکایت ہو تو ہو۔

نقوش کی بیسویں سالگرہ تھی۔ حکیم صاحب بھی مدعو تھے۔ راولپنڈی سے
بہ طورِ خاص آئے تھے۔ پہلی قطار میں بیٹھے تھے۔ تقریریں ہو رہی تھیں تعریفی جملے
پھینکے جا رہے تھے۔

مَیں نے بھی دیکھا اوروں نے بھی دیکھا کہ حکیم صاحب کرسی پر بیٹھے ہیں۔
زاویہ یہ ہے کہ چھڑی ہاتھ میں ہے۔ جس کا دوسرا سرا زمین پہ ٹِکا رکھا ہے۔
سر جھکائے، چھڑی پہ جھکے بیٹھے ہیں۔ جیسے حد درجہ ملول ہوں۔

میں نے سوچا —— نہ جانے ایسے کیوں بیٹھے ہیں۔

جب میں نے اپنے ایک دوست سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے
جواب دیا۔ "آپ بھی کیا بھولے بنتے ہیں۔ حالانکہ جانتے سب کچھ ہیں۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً یہ کہ وہ سوچتے ہوں گے کہ میں نے بھی اپنے وقت میں کیا کچھ

نہ کیا۔ مگر میری اتنی پذیرائی نہ ہوئی۔ صاحب جنوں تو وہ بھی تھے۔ پریشان کیوں نہ ہوتے ؟

بات سچی تھی۔ انھیں ایسا سوچنے کا حق تھا۔ پھر حکیم صاحب سے مجھے ملے بغیر واپس راولپنڈی چلے گئے۔ کوئی ہفتہ بھر بعد خط آیا جس میں لکھا تھا۔ سخت بیمار ہوں۔ کمر میں اتنا شدید درد ہے کہ تڑپتا رہتا ہوں۔ اس روز بھی جب کہ 'نقوش' کی تقریب تھی۔ میں ایسی ہی تکلیف میں مبتلا تھا۔ حال یہ تھا کہ بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ تڑپ رہا تھا مگر دل یہ کہتا تھا کہ یہ تقریب دوست کی ہے۔ جیسے بھی بیٹھ سکتے ہو۔ بیٹھے رہو۔"

خلوص اور اخلاق کا اس نہج پر بھی ساتھ دینا حکیم صاحب ہی کا کام تھا۔ اس بڑھاپے میں بھی، حکیم صاحب کی آواز میں طنطنہ ہے۔ گفتگو دلچسپ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے پاس ماضی کی خوبصورت یادوں کا اثاثہ ہے۔ پھر طرزِ ادا کے سلسلے میں بھی، کچھ تھیٹر کے ایکٹروں کا سا انداز ہے۔ جو ان کے پاس بیٹھ گیا، وہ انہی کا ہو گیا۔ اسے اخلاق کہیں گے یا جادوگری ؟

میں نے حکیم صاحب سے پوچھا۔ "حکیم احمد شجاع نے آپ کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ آپ خاکسار بھی رہے ہیں۔"

"جی ہاں !"

"ایک مدیر اور ادیب، خاکسار؟"

"مَیں اس تحریک سے متاثر تھا۔ ان میں جو دوسروں کی خدمت کا جذبہ تھا۔ وہ بڑا قابلِ قدر تھا۔ مَیں نے دیکھا کہ بڑے بڑے معقول لوگ اس تحریک میں شامل ہو رہے ہیں تو مَیں بھی شامل ہو گیا ایک سپاہی کی حیثیت سے، اس تحریک کی کامیابی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ کوئی کُسکؔ[1] نہ سکتا تھا۔ اگر علامہ نے کسی سے ناراض ہو کر اُس کے دُرّے بھی لگا دیئے تو اُس نے چُوں نہ کی۔ بڑے بڑے لوگ بھی اُس سزا کو ہنسی خوشی جھیل گئے۔ ایسی تحریک جس نے آزار کو بھی لذّت کا درجہ دے دیا ہو میں نے نہیں دیکھی۔

علامہ کو علم ہُوا کہ نیرنگِ خیال کا ایڈیٹر تحریک میں شامل ہو گیا ہے تو انھوں نے ایک حکم کے ذریعے مجھے بمبئی کا گورنر بنا دیا۔"

"گورنر؟"

"ہاں گورنر! جب میں نے یہ آرڈر سُنا تو ہکّا بکّا رہ گیا۔ اس آرڈر کے ساتھ حکم یہ بھی تھا کہ بمبئی سے پانچ لاکھ خاکسار بھرتی کیے جائیں۔"

انھی دنوں پشاور کے ایک سپاہی کو بھی یہ حکم ملا تھا کہ آپ کو رنگون کا گورنر بنایا جاتا ہے۔ اُن کا حال تو مجھے معلوم نہیں۔ مگر میں نے سوچا کہ میں

---

[1] یہ لفظ پنجابی کا ہے۔ جس کے معنی دم نہ مار سکنے کے ہیں۔

اتنے بڑے عہدے کو سنبھال نہیں سکتا اس لیے تحریک سے الگ ہو گیا۔ پھر تبصرہ یوں بھی کیا کہ "علامہ حساب کے ماہر تھے۔ اس مضمون کی بڑی بڑی ڈگریاں ان کے پاس تھیں۔ مگر وہ یہ حساب نہ لگا سکے کہ میری تحریک کا کیا ہو گا!"

یہ علامہ مشرقی کے آرڈر پر بمبئی کے گورنر نہ بنے۔ بنتے بھی کیسے؟ یہ تو خود صحافتی ادب کے وائسرائے تھے۔ اس لیے یہ کیوں اپنے مرتبے سے کم عہدے پر راضی ہوتے۔

پھر گویا ہوئے :۔

"میری زندگی میں ایک واقعہ ایسا ہے، جس کے بارے میں میں آج تک اس امر کا فیصلہ نہیں کر سکا کہ میرا وہ قدم صحیح تھا یا غلط، یہ قصّہ اُن دنوں کا ہے کہ جب مسجد شہید گنج کے سلسلے میں، لوگ سر سے کفن باندھے مسجد کی طرف بڑھ رہے تھے۔ دلّی دروازے سے لے کر مسجد تک لاکھوں کا مجمع ہوتا تھا۔ ہر شخص شہادت کا درجہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

انہی دنوں، اکابرین کا ایک جلسہ راولپنڈی میں ہوا۔ پیر جماعت علی شاہؒ جو اس جلسے کے صدر تھے انھوں نے اعلان کیا کہ یہاں جتنے خفیہ پولیس کے سپاہی موجود ہیں۔ وہ سب کے سب نکل جائیں۔ ورنہ انھیں قتل کر دیا جائے گا۔" چنانچہ جتنے سپاہی تھے۔ وہ چپکے سے اُٹھے، باہر نکل گئے، تب مسجد

کے دروازے بند کر دیے گئے اور جلسے کی کارروائی شروع ہوئی۔ بڑی دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ بے حد جوش تھا۔ سر کٹانے کا جذبہ بے حد راسخ!

میں اُسی جلسے کے لیے لاہور سے پنڈی پہنچا تھا۔ تقریریں سُنیں تو میرے دل میں بھی یہ آرزو انگڑائیاں لینے لگی کہ جب موت ہر شخص کے مقدر میں ہے تو کیوں نہ کسی مقصد کے لیے جان دی جائے۔ چنانچہ میں نے اپنے آپ کو کام آجانے کے لیے تیار کر لیا تھا۔ بندۂ خاک تھا۔ باشندۂ آفاق کی جستجو تھی۔

جلسہ سُن کر واپس پہنچا تو جہاں میں ٹھہرا ہُوا تھا۔ اُس دفتر کے سامنے سے ایک شخص کبھی ادھر جاتا تھا کبھی اُدھر، ساتھ ہی وہ مجھے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب دو تین مرتبہ یوں ہُوا تو میں نے اُسے بُلایا اور پوچھا۔

"خیر باشد؟"

"آپ حکیم یوسف حسن ہی ہیں؟"

"جی ہاں!"

"ایک ضروری کام ہے۔"

"فرمائیے۔"

"مجھے لاہور سے ایس۔ پی صاحب نے بھیجا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں آج کے جلسے کی صحیح رپورٹ سے آگاہ کریں۔"

"کیا تم نے مجھے مخبر سمجھا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"پھر؟"

"بات یہ ہے کہ آپ کی وساطت سے گورنمنٹ تک صحیح رپورٹ پہنچ جائے گی اور مسلمانوں کے جذبات سے حکومت آگاہ ہوجائے گی اور یہ مسلمانوں کی صحیح معنوں میں خدمت ہوگی۔ وگرنہ کسی غیر مسلم نے غلط سلط رپورٹ دے دی اور حکومت نے اُسے صحیح جان لیا تو مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچے گا۔"

یہ باتیں سُن کر میں سوچنے لگا کہ کیا کروں؟ بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے مسلمانوں کے جذبات، حکومت تک پہنچانے چاہئیں۔ چنانچہ میں نے اس دن کی ساری کارروائی تفصیل کے ساتھ، کوئی دس بارہ صفحوں میں لکھوا دی۔ بیشتر اکابرین کی تقریروں کے صحیح صحیح جملے تک لکھوا دیے۔

دوسرے دن پھر جلسہ تھا۔ میں جلسے سے فارغ ہو کر اپنے میزبان کے ہاں پہنچا۔ اُن سے کہا۔ میں اپنے ایک عزیز کے ہاں فلاں گاؤں جا رہا ہوں۔ دو تین دن تک واپس آؤں گا۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ نہ میں یہاں ہوں گا۔ نہ پولیس مجھ سے رپورٹ لے سکے گی۔ میں گزشتہ دن کی کارروائی سے تذبذب میں تھا۔ وسوسے میں تھا۔

جس دن میں گاؤں پہنچا۔ اُس رات کوئی گیارہ بجے کے قریب وہی صاحب

پھر آن دھمکے۔ "حکیم صاحب ہم تو آپ کو ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے پاگل ہوگئے ہیں۔"

"آپ سے چھپ کر تو یہاں پہنچا تھا۔ آپ یہاں بھی پہنچ گئے"۔

"یوں نہ سوچیں۔ آپ کی رپورٹ بڑی مؤثر ثابت ہوئی۔ ہمارے انسپکٹر جنرل پولیس (جو انگریز ہیں) کہتے ہیں کہ تمام رپورٹوں میں یہی رپورٹ درست معلوم ہوتی ہے باقی سب سنی سنائی اور غلط ہیں۔ انھوں نے ہمیں حکم دیا ہے کہ جس شخص نے کل رپورٹ دی تھی۔ اُسی سے آج رپورٹ حاصل کی جائے"۔

"بات یہ ہے کہ میں اس بات کو مناسب نہیں سمجھتا کہ حکومت کا آلۂ کار بنوں۔"

"آلۂ کار بننے کا سوال نہیں۔ غلط رپورٹ پر غلط کارروائی ہوسکتی ہے۔ ایسی صورت میں کیا مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچے گا؟"

غرض میں نے پھر کارروائی کی تفصیل لکھوادی۔

اس کے بعد حکیم صاحب نے تبصرہ یوں کیا کہ مجھے معلوم نہیں کہ میرا وہ قدم جادۂ حق کی جانب تھا یا اس کے برعکس، بہرحال اُس واقعہ کی پھانس کو میں آج تک نہیں نکال سکا۔ جب بھی وہ دن یاد آتے ہیں۔ ایک چبھن سی محسوس کرتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "آخر پولیس نے آپ کو اس کام کے لیے چنا کیوں؟"

"ہاں! آپ کا یہ سوال بڑا اہم ہے۔"

"اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا چھوٹا بھائی یعسوب الحسن کٹر کانگریسی تھا۔ حکومت کو اس کے خلاف بڑی شکایتیں تھیں۔ گھر والے مجھے مجبور کرتے تھے کہ یا تو یعسو[illegible]ن کو سمجھاؤ یا پھر ایس۔ پی پولیس سے کہو کہ وہ یعسوب الحسن کے بارے میں کوئی سخت قدم نہ اٹھائے۔ چونکہ ان دنوں ایس' پی پولیس محمود نظامی مرحوم کے عزیز تھے۔ اس لیے میری نظامی صاحب کی معرفت اُن سے شناسائی تھی۔"

کیا آپ بھائی کے مستقبل کی وجہ سے' رپورٹیں دینے پر راضی ہوئے تھے؟"

بالکل نہیں، اگر مسلمانوں کے مفاد میں' میرے بھائی کو پھانسی بھی لگ جاتی تو مجھے ملال نہ ہوتا اور اگر مسلمانوں کے مفاد میں مجھے بھی پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تو بھی ہنسی خوشی لٹک جاتا۔

یہ تھا ایک صاحبِ روایت شخصیت کا احوال! کچھ میری کچھ اُن کی زبانی!
